اگست ۸۸ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول
  سورۃ الحجرات کی روشنی میں
- مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اسلامی انقلاب کی برکات
  ایک بھرپور جائزہ

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

نام بھی اچھا — کام بھی اچھا
صُوفی سوپ ہے سب سے اچھا

صُوفی سوپ

اُجلی اور کم خرچ دُھلائی کے لیے بہترین صابن

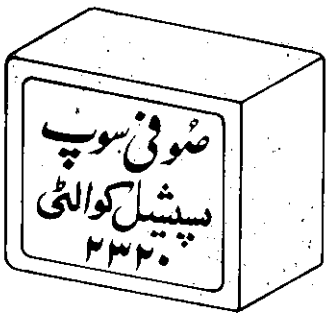

صُوفی سوپ اینڈ کیمیکل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
تار: صُوفی سوپ
ٹیلکس:
۳۹۔ فلیمنگ روڈ۔ لاہور۔ ٹیلی فون نمبر: ۲۲۵۴۴۷ - ۵۴۵۲۳

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اس میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی

جلد ۳۷
شمارہ ۸
ذوالحجہ ۱۴۰۸ھ
اگست ۱۹۸۸ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

ادارۂ تحریر

اقتدار احمد

شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

حافظ عاکف سعید

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

سعودی عرب، کویت، دوبئی، دوحا، قطر، متحدہ عرب امارات - ۲۵ سعودی ریال یا -/۱۵ روپے پاکستانی

ایران، ترکی، اومان، عراق، بنگلہ دیش، الجزائر، مصر، انڈیا - ۶ - امریکی ڈالر یا -/۱۰۰ روپے پاکستانی

یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک، جاپان وغیرہ - ۹ - امریکی ڈالر یا -/۱۵۰ "

شمالی و جنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ - ۱۲ - امریکی ڈالر یا -/۲۰۰ "

توسیل زر: ماہنامہ میثاق لاہور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ ماڈل ٹاؤن برانچ

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴ (پاکستان) لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے ماڈل ٹاؤن لاہور-۱۴ فون: ۸۵۲۶۸۳، ۸۵۲۶۱۱

سب آفس: ۱۱- داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی-فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلیشرز: لطف الرحمٰن خان مقام اشاعت: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن-لاہور

طابع: رشید احمد چودھری مطبع: مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور

مشمولات

□ عرضِ احوال ——— ۳

اقتدار احمد

الہدیٰ ——— ۹

مسلمانوں کی سیاسی و ملی زندگی کے رہنما اصول
سورۃ الحجرات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

میر تنظیم اسلامی کے بعض ذاتی اور خاندانی کوائف ——— ۱۷

ان کے اپنے قلم سے (قسط ۲)

اسلام میں ڈاڑھی کا مقام ——— ۴۱

حافظ خالد محمود خضر

نہضتِ جدید ——— ۵۵

تحریک نور بدیع الزمان سعید نورسی

قاضی ظفر الحق

مسلمانوں کی موجودہ حالت اور اسلامی انقلاب کی برکات ——— ۶۵

محمد یعقوب

□ آدابِ معاشرت ——— ۸۳

مجلس کے آداب

شیخ رحیم الدین

□ رفتارِ کار ——— ۸۵

مرتب: محمد یعقوب

اقتدار احمد

عرضِ احوال

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"میثاق" کے قارئین کو بتانے کی ضرورت نہیں، صرف یاد دلانے کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ یہ ماہنامہ مرکزی انجمن خدام القرآن اور اس کا ماہوار جریدہ "حکمت قرآن"، قرآن اکیڈمی، قرآن کالج اور خود تنظیم اسلامی مع اپنے مقاصد، اپنی اساسی دعوت اور اپنے طریق کار کے، ایک ہی سراج منیر کی مختلف کرنیں ہیں۔ ان سب کا آغاز دعوت رجوع الی القرآن سے ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے ایک بندے کو توفیق دی کہ وہ قرآن عظیم کو اپنا امام، نور و ہدایت، رحمت اور آخری دلیل بنائے بلکہ واقعہ یہ ہے اللہ کے کلام مبین نے اس شخص کو اپنی تحویل میں لے لیا یعنی صحیح معنوں میں POSSESS کر کے چھوڑا۔ قرآن مجید کے اعجاز کا بیان تو ان سطور کے راقم کی استعداد سے بہت بلند ہے لیکن یہ بہرحال آنکھوں دیکھی بات ہے کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کو جنہوں نے اپنا پورا زمانۂ تعلیم بزبان انگریزی ایک فنی علم حاصل کرتے گزارا، دینی درسگاہوں کے فیض سے محروم رہنے اور عربی زبان کی بھی باقاعدہ تحصیل کے بغیر، محض کتاب اللہ سے محبت اور تعلق قلبی نے اس درجہ مسحور کیا کہ وہ سالہاسال اس کی تعلیم اور تعلّم کو معاش کی مشقت کے ساتھ چلا کر جب تھک گئے تو انہوں نے دونوں میں سے ایک کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اسے قرآن سے سچے عشق اور تائید ایزدی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ گلو خلاصی معاش کی تگ و دو سے ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن، ان کا پورا وقت لوگوں کو ہدایت کے اسی ابدی سرچشمے کی طرف بلانے میں صرف ہوا ہے۔ ع جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گزری ہے۔

انہوں نے انجمن بنائی تو اسی نام سے، کانفرنسیں اور محاضرات کئے تو اسی حوالے سے، اکیڈمی بنائی تو اسی غرض سے اور آخر میں ایک کالج کی بنا رکھی تو اسی کام کے لئے کہ نوجوانوں کو مروجہ نصاب تعلیم کے ساتھ قرآن مجید سے اس حد تک متعارف کرا دیا جائے اور عربی زبان میں اتنی اہلیت بہم پہنچا دی جائے کہ پھر اگر اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو اپنے دین کی خدمت کے

لئے قبول فرمالے تو ان کی عملی و علمی کاوشوں اور ہدایت و حکمت دینی کے اصل ماخذ کے مابین کوئی حجاب موجود نہ ہو جو اُسے دائیں بائیں اور آگے پیچھے ہر طرف پھیلے ہوئے مغالطوں میں سے کسی میں مبتلا ہونے کے امکان سے دوچار کر دے۔ تجربے اور مشاہدے کی بات ہے' کوئی راز نہیں کہ دین کا کام کرنے کا داعیہ کچھ لوگوں میں پیدا تو ہو جاتا ہے لیکن قرآن مجید اور احادیث نبوی کی زبان سے اجنبیت اور نتیجے میں واقع ہونے والی نارسائی ان میں سے اکثر کو خرد کی گتھیاں سلجھانے میں الجھا دیتی ہے اور وہ جنوں کی اس کیفیت سے محروم رہ جاتے ہیں جو دین کو دنیا پر ترجیح دینے کے لئے ضروری ہے۔

محترم ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید کے ساتھ زندہ و متحرک تعلق کا ایک انعام یہ بھی ملا کہ انہوں نے اپنی جماعت 'تنظیم اسلامی' کی تاسیس کی تو اس کا منہج اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور محور خود قرآن مجید کو رکھا۔ تنظیم اسلامی کے دعوتی اجتماعات میں پروگرام کی واحد شق درس قرآن ہوتی ہے۔ توسیع دعوت کا کام دروس قرآن کے ان آڈیو اور ویڈیو کیسٹس سے لیا جاتا ہے جو امیر تنظیم اسلامی ملک کے طول و عرض اور دنیا کے دور دراز گوشوں میں بڑے بڑے اجتماعات کے روبرو بنفس نفیس دیتے رہے اور آج بھی دیتے ہیں۔ اور تو اور تنظیم اسلامی کا لٹریچر بھی خود قرآن حکیم کے ایک منتخب نصاب اور حکمت قرآنی ہی کی بعض توضیحات پر مشتمل ہے۔ محترم ڈاکٹر صاحب کے ایک کتابچے کا عنوان جس کی اشاعت و تقسیم پر خاص توجہ دی گئی اور جو اردو' عربی' انگریزی' فارسی اور سندھی زبانوں میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہو چکا ہے 'تنظیم اسلامی کا تعارف نہیں بلکہ "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" ہے۔ جو اس اعتبار سے ثقہ دینی حلقوں اور عامۃ المسلمین سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے کہ اس میں جس بے غرضی' دردمندی' خلوص اور دو اور دو چار کے سے انداز میں مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کیا گیا ہے' وہ ایک بار تو ضرور ہی ہر کلمہ گو کے دل میں کتاب ہدایت کی طرف التفات پیدا کر دیتا ہے۔

اور یہ سب کچھ محض حسن اتفاق یا ایک شخص کے ذاتی ذوق و شوق کا مظہر نہیں' اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مجرب نسخہ ہے۔ قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ یہ کتاب ہدایت تاریخ انسانی کے اس مثالی طور پر مکمل ترین انقلاب کا واحد

منشور، مکمل لائحہ عمل اور تنہا گائیڈ بک تھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی دنیا میں برپا کر کے دکھایا جس پر آج ہم چلتے پھرتے ہیں۔ اب جس کسی کو عظمت رفتہ کو آواز دینا مقصود ہو، تجدید دین اور احیائے اسلام مطلوب ہو اور اسلامی انقلاب کی جھلک دیکھنے اور دکھانے کی آرزو ہو، اس کے لئے واحد اور موثر طریق کار یہی ہو گا کہ اسی کتاب کو حرز جان بنائے، اسی سے قلب و ذہن کا رشتہ استوار کرے اور اسی کو رہنما بنائے۔ اس امت میں اصلاح احوال کا کام جب بھی ہوا اسی طریقے سے ہو گا جس طریقے سے خیر القرون میں ہوا تھا۔ محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی دعوت رجوع الی القرآن اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا نکتۂ آغاز ہے۔ ان کے دروس قرآن سب کے لئے عام ہیں۔ بچوں سے لے کر بوڑھوں تک مرد و زن سب ہی اپنی اپنی ضرورت اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن لیکن اپنا اپنا دامن

البتہ نوجوانوں کو قرآن مجید کی طرف متوجہ کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ ہمارا نظام تعلیم تا حال پرانی ڈگر پر چل رہا ہے اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کو تو کفر و الحاد کی آندھی کا سامنا کئے بغیر چارہ ہی نہیں جو الا ماشاء اللہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کے عقائد اور ایمانیات کے ڈھانچے کی چولیں ہلا کر چھوڑتی ہے۔ وہ زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں، ان کے دل دین کی مبادیات پر ادنیٰ درجے کے ایقان سے بھی محروم ہو جاتے ہیں اور معاشرتی دباؤ کے تحت جب وہ کچھ رسوم و قیود کی پابندی کرتے ہیں تو اس کا اثر ان کی شخصیت پر الٹا ہوتا ہے۔ اندر سے وہ بٹ کر رہ جاتے ہیں، آدھے تیتر آدھے بٹیر..... اس عارضے کا شافی علاج بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ابدی معجزے یعنی قرآن مجید ہی میں ہے لیکن اس سے فائدہ اٹھانے میں عربی زبان سے عدم واقفیت اور کلام مبین کے اسلوب بیان سے اجنبیت آڑے آتی ہے۔ حصول ثواب کے لئے اس کی تلاوت بھی یقیناً مبارک ہے لیکن دل و دماغ پر کسی دیرپا اثر اور افکار و معتقدات میں اس درجے کی تبدیلی جو عملی زندگی پر نقوش چھوڑ سکے، قرآن مجید کو سمجھے اور اس پر غور کئے بغیر ممکن نہیں۔

انجمن خدام القرآن کے قیام کا مقصد ہی منبع ایمان اور سرچشمۂ یقین یعنی قرآن حکیم کے علم و حکمت کی اس پیمانے اور ایسی علمی سطح پر تشہیر و اشاعت ہے جو امت مسلمہ کے فہیم عناصر میں

تجدید ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا کر سکے اور یوں اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور غلبۂ دین حق کے دور ثانی کی راہ ہموار ہو جائے۔ اس ضمن میں متعدد منصوبوں پر کام کیا گیا جن میں سے قابل ذکر "رفاقت سکیم" اور "دو سالہ نصاب" ہیں۔ اول الذکر میں ایسے نوجوانوں کو شامل کیا گیا تھا جنہوں نے کسی نہ کسی شعبہ میں کم سے کم گریجویشن کی ہو اور جو تعلیم و تعلم قرآن اور خدمت دین کے لئے اپنی زندگیاں وقف کرنے کا ارادہ کر چکے ہوں۔ الحمدللہ کہ اس سکیم میں متعدد باصلاحیت نوجوانوں نے شاندار مستقبل اور پیشہ ورانہ کیریئر قربان کر کے از سر نو طالب علمانہ زندگی کو اختیار کیا اور ان میں سے بیشتر اب قرآن اکیڈمی کا مستقل اثاثہ ہیں یا پھر اپنی اپنی جگہ خدمت دین میں مصروف ہیں۔ دو سالہ نصاب میں سے لگ بھگ پچاس ایسے افراد کو گزارا گیا جو گریجویٹ یا لگ بھگ اتنی ہی اہلیت کے حامل تھے۔ انہیں عربی اور فارسی میں اس قدر استعداد بہم پہنچائی گئی کہ علوم دینی کے اس عظیم ورثے سے متعارف ہو سکیں جو ان زبانوں میں مقیّد ہے' قرآن مجید کا ترجمہ سبقاً سبقاً اس انداز میں پورا کرایا گیا کہ بالآخر وہ ترجمے سے بے نیاز ہو جائیں۔ حدیث و اصول حدیث اور فقہ و اصول فقہ سے بھی آشنائی پیدا کی گئی کہ دین کا فلسفہ اور اس کی حکمت کے اسرار ان کے بغیر نہیں کھلتے۔ یہ نصاب جس سے فارغ التحصیل ہونے والے حضرات کی اکثریت میں اللہ تعالیٰ نے اتنی اہلیت پیدا فرما دی ہے کہ پورے اعتماد اور یکسوئی کے ساتھ اپنے اپنے حلقہ اثر میں قرآن مجید کے درس کی محفلیں جمائے ہوئے ہیں' ان دنوں موقوف ہے۔ البتہ اس کے دوبارہ اجراء پر بھی سوچا جا سکتا ہے۔ دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یافتہ معدودے چند نوجوانوں کی طرف سے اس کے لئے اصرار موصول ہوا ہے لیکن جب تک ان کی تعداد اتنی نہ ہو جائے کہ مطلوبہ انتظامات کا جواز بن سکے' اس وقت تک اس بھاری پتھر کو صرف چوما جا سکتا ہے' اٹھانا ممکن نہیں۔ قارئین کی توجہ کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ ان کے حلقہ تعارف میں اگر ایسے باہمت جوان موجود ہوں جو اپنے دین کو سمجھنے اور سمجھا سکنے کی استعداد پیدا کر لینے کی خواہش رکھتے اور اس کے لئے عمر عزیز کے دو سال فارغ کرنے پر آمادہ ہوں تو انہیں قرآن اکیڈمی سے رابطہ قائم کرنے کو کہیں۔ مطلوبہ تعلیمی اہلیت بی۔ اے' بی۔ ایس۔ سی یا کوئی اور مساوی ڈگری ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ دو سالہ نصاب بھی قرآن اکیڈمی کا ایک مستقل شعبہ رہے۔

انجمن خدام القرآن نے پچھلے سال قرآن کالج کا آغاز کیا ہے جس میں ایف اے ' ایف ایس سی اور آئی کام یا ڈی کام یعنی ہائر سیکنڈری تعلیم سے فارغ شدہ طلبہ کو تین سال میں بی۔ اے پاس کرایا جائے گا۔ اس سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ اور ان کے والدین پانچ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر پراسپکٹس طلب کر لیں تو پوری تفاصیل ان کے علم میں آ جائیں گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ جامعہ پنجاب کے قواعد کے مطابق لازمی مضامین یعنی انگریزی (۲۰۰ نمبر) اور اسلامیات و مطالعہ پاکستان (۱۰۰ نمبر) ' دو انتخابی مضامین (کل ۴۰۰ نمبر) اور ایک اختیاری مضمون (۱۰۰ نمبر) کی تیاری کرانے کے علاوہ نوخیز ذہنوں میں دین سے شعوری وابستگی کا بیج بونے کے لئے جو اضافی تعلیم دی جائے گی وہ تجوید ' عربی قواعد اور بول چال ' ترجمہ قرآن مکمل مع مختصر تشریح ' تعلیم حدیث اور قرآن مجید کے اس منتخب نصاب کے نسبتاً تفصیلی مطالعے پر مشتمل ہوگی جو انجمن کے قیام کی بنیاد بنا اور جس سے حکمت قرآنی اس حد تک آشکار ہو جاتی ہے کہ پھر اس سے دل و دماغ کو روشن کرنے کے لئے پورے مصحف کو پڑھنے اور سمجھنے کا مضبوط داعیہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس سارے کام کے لئے طلبہ سے محض ایک سال اضافی طلب کیا جا رہا ہے۔ یہ ایک سال بظاہر اضافی ہے لیکن اگر ان حالات پر نظر ڈالی جائے جن کا سکہ ان دنوں ہمارے کالجوں اور جامعات میں رواں ہے تو معلوم ہوگا کہ کسی نہ کسی سبب سے تعلیمی دورانئے میں اضافہ ہمارے ہاں ایک معمول بن چکا ہے۔ اب وہ زمانے لد گئے جب چودہ سال میں ایک طالب علم بی۔ اے ' بی ایس سی ' بی کام ' سولہ سال میں ایم اے وغیرہ اور سولہ ہی سال میں ایل ایل بی پاس کر لیا کرتا تھا۔ اور نہیں تو امتحانات اور داخلوں کے نظام میں ہی کہیں نہ کہیں کوئی ایسی اڑچن آ جاتی ہے کہ ایک سال فالتو لگائے بغیر گزارا نہیں ہوتا۔ قرآن کالج سے بی۔ اے پاس کرنے والے طلبہ اور ان کے بزرگوں کو جو بڑا امتحان درپیش ہے وہ فی الحقیقت یہ ہے کہ ایم اے ' ایل ایل بی یا بی ایڈ میں داخلہ ملنے کے مواقع کی موجودگی میں بھی اور تعلیمی میدان میں معاش کے علاوہ سول سروس کے امتحانات پاس کر لینے کے امکانات کے باوصف سائنس اور سائنسی علوم و فنون کے دروازے ان پر بند ہو جائیں گے جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ روشن مستقبل اور کامیابی پر کھلتے ہیں۔ سو اگرچہ یہ ضمانت کہیں سے بھی حاصل نہیں ہوتی کہ اپنی سی پوری کوشش کے باوجود نمبروں کی اس منزل ہفت خواں کو وہ ضرور ہی طے

کرلیں گے جس کے بغیر مستقبل کی روشنی ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتی' تاہم یہ اپنے آپ سے ایک شعوری فیصلہ لینے کا سوال ہے۔ کیا دنیا کی کامیابی و کامرانی ہی سب کچھ ہے؟ کیا دین اپنی اس غربت کے دور میں ہماری طرف سے اتنی سی قربانی کا بھی مستحق نہیں؟

قرآن کالج کے اس پروگرام کی اصل روح یہ ہے کہ جو طلبہ بھی اس میں داخلے کے لئے ہمیں میسر آئیں ان کے ناپختہ ذہنوں پر عظمت قرآن کا نقش بٹھادیا جائے اور ان کے صاف و شفاف دلوں میں دین سے تعلق اور محبت کی شمع روشن کر دی جائے۔ پھر وہ کہیں بھی جائیں' کسی بھی میدان کو اپنی ترکتازی کے لئے منتخب کریں' زمانے کا سامنا کرتے ہوئے ان کے ذہن کتنے ہی حجابات قبول کرلیں اور مادہ پرستی کا کتنا ہی زنگ ان کے دلوں پر جم جائے' دین سے تعلق کی ایک چنگاری ضرور کہیں نہ کہیں دبی رہ جائے گی جو کسی بھی وقت ان کی زندگی کا نقشہ بدل ڈالنے کا سبب بن سکے گی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ انہی طلبہ میں سے چند کو اللہ تعالیٰ اپنے دین کی خدمت کے لئے قبول فرمالے اور وہ یہاں سے بی۔ اے پاس کرلینے کے بعد بھی دنیا داروں کی بھیڑ میں گم ہو جانے کے لئے آمادہ نہ ہوں۔ دین کا علم حاصل کرنے اور پھر اسے پھیلانے کا داعیہ اس شدت سے ان میں ابھر آئے کہ وہ اپنے کیریئر تج دیں اور اپنی صلاحیتیں اللہ کے کلمے کو بلند کرنے میں کھپانے کا فیصلہ کرلیں۔ ایسا ہوا تو کتنا مبارک ہوگا یہ فیصلہ اور کس قدر اجر کمالے جائیں گے وہ والدین جو اولاً اپنے بچوں میں اس ارادے کے پیدا ہونے کا باعث اور بعد میں ان کے ممد و معاون بنیں۔ ہمارے ہاں ایصال ثواب اور صدقۂ جاریہ کے بہت سے تصورات رائج ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ اولاد کا دین کی خدمت میں مصروف ہونا والدین کے لئے سب سے بڑا صدقۂ جاریہ اور ثواب کا نہ ختم ہونے والا ایصال ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان توقعات میں سے اعلیٰ چھوڑ' ادنیٰ درجے کی توقع کے لئے بھی یہ لازم آتا ہے کہ اللہ کے دین کے لئے اپنی اولاد میں سے ذہین تر اور قابل ترین بچوں کو اس رخ پر لگایا جائے۔ از کار رفتہ' معذور یا کسی بھی طرف چلنے میں ناکام رہنے والے طلبہ کو اگر ادھر بھیج دیا گیا تو نتیجہ معلوم!۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ناپسندیدہ طرز عمل سے اجتناب کرنے کی توفیق دے کہ اچھا مال تو ہم دنیا کے لئے سمیٹ رکھیں اور گھٹیا حصہ دین کے کھاتے میں ڈال کر یہ اطمینان محسوس کریں کہ حق ادا ہو گیا۔

(باقی صفحہ ۹۱ پر)

الہدیٰ

مباحثِ عمل صالح

مُسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول

سورۃ الحجرات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

قارئین کے علم میں ہے کہ آج سے چند سال قبل 'الھدیٰ' کے عنوان سے محترم ڈاکٹر صاحب کے مرتب کردہ منتخب نصاب کے دروس کا جو پروگرام مسلسل ۱۵ ہفتوں تک پاکستان ٹیلی ویژن سے ہفتہ وار نشر ہوتا رہا تھا، ابھی وہ نصاب بقدر نصف مکمل ہوا تھا کہ پروگرام اچانک بند کر دیا گیا۔ ٹی وی پر نشر شدہ ان دروس کو کیسٹوں سے منتقل کر کے بحمداللہ 'میثاق' میں 'الھدیٰ' ہی کے زیرِ عنوان شائع کیا جاتا ہے اور اب ان نشر شدہ دروس میں سے صرف سورۃ الحجرات کے درس کی اشاعت باقی رہ گئی ہے محترم ڈاکٹر صاحب کے قلم سے اس سورۂ مبارکہ کے مضامین کا ایک بھرپور تعارف چونکہ اس سے قبل 'مسلمانوں کی سیاسی و ملّی زندگی کے رہنما اصول' سورۃ الحجرات کی روشنی میں' کے زیرِ عنوان پمفلٹ کی شکل میں شائع شدہ موجود ہے لہٰذا اس سورۂ مبارکہ کے باضابطہ درس سے قبل 'مناسب سمجھا گیا کہ مذکورہ بالا جامع تحریر شاملِ اشاعت کر دی جائے تاکہ سورۃ کے مضامین کا بھرپور خاکہ سامنے آجائے۔

(ادارہ)

انسان کی عملی زندگی کے ذیل میں اس منتخب نصاب میں چھٹا اور آخری مقام سورۂ حجرات مکمل ہے یہ عظیم سورت اجتماعیاتِ انسانی کے ذیل میں عام سماجی و معاشرتی معاملات سے بلند تر سطح پر نہ صرف قومی و ملی امور سے بحث کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کی تاسیس اور تشکیل کن بنیادوں پر ہوتی ہے اور اس میں اتحاد و اتفاق اور یک جہتی و ہم رنگی کیسے برقرار رکھی جاسکتی ہے بلکہ سیاست و ریاست کے متعلق امور سے بھی بحث کرتی ہے کہ اسلامی ریاست کس بنیاد پر قائم ہوتی ہے، اس کا دستور اساسی کیا ہے، اس کی شہریت کسے حاصل ہوتی ہے اور اس کا دنیا کے دوسرے معاشروں یا اس کی دوسری ریاستوں سے تعلق کن بنیادوں پر استوار ہوگا۔

اس سورت کو بغرض تفہیم تین حصّوں میں منقسم سمجھنا چاہیئے۔

پہلا حصّہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعی کے اصل الاصول، یعنی اسلامی ریاست کے دستور اساسی اور ملّتِ اسلامیہ کی شیرازہ بندی[1] کے اصل قوام یعنی "مرکزِ ملّت" سے بحث کرتا ہے۔

چنانچہ پہلی ہی آیت نے غیر مبہم طور پر واضح کر دیا کہ مسلمان معاشرہ اور اسلامی ریاست 'مادر پدر آزاد' نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے 'پابند' ہیں، اور مسلمانوں کی آزادی کے معنی صرف یہ ہیں کہ خدا اور رسول کی اطاعت کے لیے دوسری ہر طرح کی غلامی سے آزاد ہو جائیں۔ گویا کہ ایک فرد کی طرح اجتماعیت بھی صرف وہی 'مسلمان' قرار دی جاسکتی ہے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشبیہ کے مطابق اسی طرح اللہ اور اس کے رسول صلعم کے احکام کے ساتھ بندھی ہوئی ہو جیسے ایک گھوڑا اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ آیت مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کے اصل الاصول یعنی ایک اسلامی ریاست کے دستور اساسی میں حاکمیت سے متعلق اوّلین دفعہ کو متعین کر دیتی ہے کہ یہاں حاکمیت نہ کسی فرد کی ہے نہ طبقے کی، نہ قوم کی ہے نہ جمہور کی بلکہ صرف خدا کی ہے (اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ) اور اسلامی ریاست کا کام (FUNCTION) صرف یہ ہے کہ رسولؐ کی تشریح و توضیح کے مطابق خدا کی مرضی و منشا کو پورا کرے

آیت کے اخیر میں اس اطاعت کی اصل رُوح کی جانب بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ یعنی تقوی اللہ۔ اس کے بعد مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی 'اصل ثانی' کو واضح کیا گیا جس کے گرد مسلمانوں کی حیاتِ ملّی

---

[1] کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

کی اصل شیرازہ بندی ہوتی ہے یعنی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ادب، آپ کی تعظیم و توقیر، آپ سے محبت اور عشق اور آپ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی (وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ) اور ہر اُس قول و فعل یا رویّے اور برتاؤ سے کامل اجتناب جس سے ادنیٰ ترین درجے میں بھی گستاخی یا تحقیر و توہین کا پہلو نکلتا ہو (ع 'ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر')

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی ان دو بنیادوں میں سے پہلی چونکہ عقیدۂ توحید فی الالوہیۃ کا لازمی نتیجہ ہے اور اس اعتبار سے گویا قرآن حکیم کے ہر صفحے پر بطرزِ جلی اس کا ذکر موجود ہے لہٰذا اس مقام پر اس کا ذکر صرف ایک آیت میں کر دیا گیا ہے۔ اس کے بالمقابل اصل ثانی پر انتہائی زور دیا گیا۔ اور بعض متعین واقعات پر گرفت اور سرزنش کے ضمن میں واضح کر دیا گیا کہ ؎

مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست!
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اس لیے کہ حقیقت یہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں ملّتِ اسلامیہ کے پاس وہ 'مرکزی شخصیت' موجود ہے جس سے تمدنِ انسانی کی وہ فطری ضرورت بہ تمام و کمال اور بغیر تصنّع و تکلف پُوری ہو جاتی ہے جس کے لیے دوسری قوموں کو باقاعدہ تکلف و اہتمام کے ساتھ شخصیتوں کے بُت تراشنے اور ہیرو (HEROES) گھڑنے کا کھکھیڑ مول لینا پڑتا ہے۔ مزید برآں دنیا کی دوسری اقوام تو ع "می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر" کے مصداق مجبور ہیں کہ ہر دور میں ایک نئی شخصیت کا بُت تراشیں، لیکن ملّتِ اسلامیہ کے پاس ایک دائم و قائم مرکز، موجود ہے جو اس کے ثقافتی تسلسل (CULTURAL CONTINUITY) کا ضامن ہے، اس اعتبار سے دیکھا جائے تو "اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ" میں خطاب صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی سے نہیں بلکہ تا قیامِ قیامت پُوری اُمّتِ مسلمہ سے ہے، اس دوام اور تسلسل کے ساتھ ساتھ، اُمّتِ مسلمہ کی وسعت اور پھیلاؤ پر بھی نگاہ رہے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی 'مرکزیت' ہی کا ثمرہ ہے کہ مشرقِ اقصیٰ سے لے کر مغرب بعید تک پھیلی ہوئی قوم میں نسل و لسان کے شدید اختلاف اور تاریخی و جغرافیائی عوامل کے انتہائی بُعد کے علی الرغم ایک گہری ثقافتی یک رنگی (CULTURAL HOMOGENITY) موجود ہے۔ اور اسی کی فرع کے طور پر اس حقیقت پر بھی ہمیشہ متنبہ رہنا چاہیے کہ مختلف مسلمان ممالک میں علیحدہ علیحدہ قیادتوں اور 'علاقائی' شخصیتوں کو بس ایک حد تک ہی اُبھارنا چاہیے، اس سے تجاوز کی صورت میں اس سے 'وحدتِ ملّت' کی جڑیں کمزور ہونے کا اندیشہ ہے۔ گویا بقول علامہ اقبال ؎

یہ زائرینِ حریمِ مغرب ہزار رہبر بنیں ہمارے ہمیں بھلا ان سے واسطہ کیا جو تجھ سے نا آشنا رہے ہیں

روئے زمین کی تمام مسلمان اقوام کو معیارِ قیادت ایک ہی رکھنا چاہیے اور وہ ہے ذاتِ محمدؐ فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم۔

مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی کی متذکرہ بالا دو بنیادوں میں سے ایک زیادہ تر عقلی و منطقی ہے اور دوسری نسبتاً جذباتی، پہلی پر دستور و قانون کا دار و مدار ہے اور دوسری پر تہذیب و ثقافت کی تعمیر ہوتی ہے اور ان دونوں کا باہمی رشتہ ایک دائرے اور اس کے مرکز کا ہے۔ مسلمان اجتماعیت کے اُس دائرے میں 'محصور' ہے جو خدا اور اس کے رسول کے احکام نے کھینچ دیا ہے اور اس کے مرکز کی حیثیت آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دلآویز اور دلنواز شخصیت کو حاصل ہے جن کے اتباع کے جذبے سے اس ہیئت اجتماعی کو ثقافتی یک رنگی نصیب ہوتی ہے اور جن کی محبت کے رشتے سے اس کے افراد ایک مرکز سے بھی وابستہ رہتے ہیں اور باہم دِگر بھی جڑے رہتے ہیں۔

(اب اس معذرت کے ساتھ آگے چلتا ہوں کہ 'مقام رسالت' کے ذکر میں طولِ کلام فی الواقع
ع " لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم " کے مصداق ہے)

دوسرا حصہ ان احکامات پر مشتمل ہے جن پر عمل پیرا ہونے سے ملّتِ اسلامیہ کے افراد اور گروہوں اور جماعتوں کے مابین رشتۂ محبت و الفت کے کمزور ہونے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں اور اختلاف و انتشار اور فتنہ و فساد کو بڑھنے سے روکا جا سکتا ہے۔ ان احکامات کو بھی مزید دو عنوانات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ اہم تر احکام جو وسیع پیمانے پر گروہوں کے مابین تصادم سے بحث کرتے ہیں اور دوسرے وہ بظاہر چھوٹے لیکن حقیقتہً نہایت بنیادی احکام جو خالص انفرادی سطح پر نفرت اور عداوت کا سدّباب کرتے ہیں۔

مقدم الذکر احکام دو ہیں: ۱۔ افواہوں کی روک تھام اور کسی حتمی فیصلے اور عملی اقدام سے قبل اچھی طرح تحقیق و تفتیش اور چھان بین کا اہتمام[1] اور ۲۔ نزاع کے واقع ہو جانے کی صورت میں صحیح طرزِ عمل یعنی ا: یہ کہ فریقین کے مابین صلح کرانے کو اجتماعی ذمہ داری اور معاشرتی فرض سمجھا جائے۔ گویا کہ لاتعلقی (INDIFFERENCE) کی روش کسی طور صحیح نہیں، ب: اس کے بعد بھی اگر ایک فریق زیادتی ہی پر

---

[1] اس سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ مبارک مستحضر رہنے چاہئیں کہ "كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ" ایک شخص کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ بات بالکل کافی ہے کہ وہ جو کچھ سنے اُسے آگے بیان کر دے یعنی آگے بیان کرنے سے قبل اس کی صحت کی تحقیق و تصدیق نہ کرے)

مصر رہے تو اب اس کا مقابلہ صرف فریقِ ثانی ہی کو نہیں پوری ہیئتِ اجتماعیہ کو کرنا چاہیے اور حج: جب وہ گردن جھکا دے تو از سرِ نو عدل و قسط پر مبنی صلح کرا دی جائے۔ (اس مقام پر عدل اور قسط کا مکرر مؤکد ذکر خاص طور پر اس لیے ہے کہ جب پوری ہیئتِ اجتماعیہ اس فریق سے ٹکرائے گی تو فطری طور پر اس کا امکان موجود ہے کہ دوبارہ صلح میں اس فریق پر غصّے اور جھنجھلاہٹ کی بنا پر زیادتی ہو جائے!)

مؤخر الذکر احکام چھ نواہی پر مشتمل ہیں یعنی ان میں ان چھ معاشرتی برائیوں سے منع فرمایا گیا ہے جن کے باعث بالعموم دو افراد یا گروہوں کے مابین رشتۂ محبت و الفت کمزور پڑ جاتا ہے اور اس کی جگہ نفرت و عداوت کے بیج بوئے جاتے ہیں اور ایسی کدورت پیدا ہو جاتی ہے جو پھر کسی طرح نہیں نکلتی۔ اس لیے کہ عام ضرب المثل کے مطابق تلواروں کے گھاؤ بھر جاتے ہیں لیکن زبان کے زخم کبھی مندمل نہیں ہوتے! وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔ ۱۔ تمسخر (اس کے سدباب کے لیے اس نہایت گہری حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کے صرف ظاہر کو دیکھتا ہے اور اسی کی وجہ سے تمسخر کا مرتکب ہو بیٹھتا ہے حالانکہ اصل چیز انسان کا باطن ہے اور خدا کی نگاہ میں انسانوں کی قدر و قیمت اُن کے باطن کی بنیاد پر ہے) ۲۔ عیب جوئی اور تہمت (اس کے ذیل میں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ جب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کسی دوسرے مسلمان کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ کو عیب لگانا ہے) ۳۔ تنابز بالالقاب یعنی لوگوں یا گروہوں کے توہین آمیز نام رکھ لینا (اس کے ضمن میں اشارہ فرمایا کہ اسلام لانے کے بعد بُرائی کا نام بھی نہایت بُرا ہے) ۴۔ سوءِ ظن (اس لیے کہ بہت سے ظن گناہ کے درجے میں ہیں) ۵۔ تجسّس اور ۶۔ آخری اور اہم ترین، غیبت جس کی شناعت کے اظہار کے لیے حد درجہ بلیغ تشبیہ اختیار کی یعنی یہ کہ کسی مسلمان کی غیبت ایسی ہے جیسے کسی مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔ (اس لیے کہ جس طرح ایک مردہ اپنے جسم کا دفاع نہیں کر سکتا اسی طرح ایک غیر موجود شخص بھی اپنی عزّت کے تحفّظ پر قادر نہیں ہوتا)

الغرض ان آٹھ اوامر و نواہی سے مسلمانوں کی ہیئتِ اجتماعیہ کا استحکام مطلوب ہے۔ اس لیے کہ جس طرح بڑی سے بڑی فصیل بھی بہرحال اینٹوں ہی سے بنی ہوتی ہے اور اس کے استحکام کا دارومدار جہاں اینٹوں کی پختگی اور مضبوطی پر ہوتا ہے وہاں اینٹوں کو جوڑنے والے گارے یا چُونے یا کسی دیگر مسالے (CEMENT SUBSTANCE) کی پائیداری پر بھی ہوتا ہے۔ اسی طرح ملّتِ اسلامیہ کے استحکام کیلئے بھی جس قدر مسلمانوں میں سے ہر ہر فرد کا سیرت و کردار کے اعتبار سے پختہ ہونا ضروری ہے۔ اسی قدر اُن کے مابین رشتۂ محبّت و اُلفت کی استواری بھی لازمی ہے۔ یہ البتہ واضح رہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا استحکام

عام قومی تصورات کے تحت دنیوی غلبہ و اقتدار کے لیے نہیں بلکہ اس لیے مطلوب ہے کہ وہ ع "ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے" کے مصداق خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے کا ذریعہ اور آلہ (INSTRUMENT) ہے!

تیسرا حصّہ دو انتہائی اہم مباحث پر مشتمل ہے!

۱۔ پہلی بحث انسان کی عزت و شرف کے معیار سے متعلق ہے جس کے ذیل میں واضح کر دیا گیا ہے کہ انسان کی عزت و ذلت یا شرافت و رذالت کا معیار نہ کنبہ ہے نہ قبیلہ، نہ خاندان ہے نہ قوم، نہ رنگ ہے نہ نسل، نہ ملک ہے نہ وطن، نہ دولت ہے نہ ثروت، نہ شکل ہے نہ صورت، نہ حیثیت ہے نہ وجاہت، نہ پیشہ ہے نہ حرفہ اور نہ مقام ہے نہ مرتبہ بلکہ صرف 'تقویٰ' ہے اس لیے کہ پوری نوع انسانی ایک ہی خدا کی مخلوق بھی ہے اور ایک ہی انسانی جوڑے (آدم و حوا) کی اولاد بھی۔

یہ بحث فی نفسہٖ بھی نہایت اہم ہے اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں بدامنی اور انتشار اور انسانوں کے مابین تصادم اور ٹکراؤ کا بہت بڑا سبب نسل اور نسب کا غرور ہی ہے اور یہ قومی گروہی مفاخرت ہی ہے جو مابین الانسانی منافرت کا اصل سبب بنتی ہے (اس سلسلے میں یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بدترین دشمن[1] بھی معترف ہیں کہ آپ نے واقعۃً انسانی عزت و شرف کی متذکرہ بالا تمام غلط بنیادوں کو منہدم کر دیا اور انسانی مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ایک معاشرہ عملاً قائم فرما دیا!) لیکن خاص طور پر اس مقام پر اس بحث کے دو رُخ لائق توجہ ہیں۔ ایک: یہ کہ اُوپر جن سماجی برائیوں سے منع فرمایا گیا تھا مثلاً تمسخر و استہزاء اور عیب جوئی و بدگوئی اُن کی جڑ میں جو گمراہی کارفرما ہے وہ اصل میں یہی نسل و نسب کی بنیاد پر تفاخر و تباہی کا جذبہ ہے اور دوسرے: یہ کہ اسلام اِن میں سے کسی چیز کی بنیاد پر انسانوں کے مابین تفریق و تقسیم کا قائل نہیں بلکہ وہ ایک خالص نظریاتی معاشرہ اور ریاست قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کے یہاں انسانوں کے مابین صرف ایک تقسیم معتبر ہے اور وہ ہے ایمان کی تقسیم اور اہلِ ایمان کے حلقے میں بھی اس کے نزدیک صرف ایک معیارِ عزّت و شرف معتبر ہے اور وہ ہے تقویٰ کا معیار!

---

[1] چنانچہ جی ایچ ویلز (H.G. WELLS) نے اپنی "مختصر تاریخ عالم" میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبۂ حجۃ الوداع کے ذیل میں واضح طور پر اقرار کیا ہے کہ انسانی مساوات اور اخوت کے نہایت اُونچے وعظ تو اگرچہ مسیح ناصری (علیٰ نبینا وعلیہ الصّلوٰۃ والسلام) کے یہاں بھی موجود ہیں لیکن ان بنیادوں پر تاریخ میں عملی بار ایک معاشرے کا واقعی قیام صرف محمد عربی (صلی اللہ علیہ وسلم وفداہ ابی و امی) کا کارنامہ ہے۔

اس سلسلے میں ضمنی طور پر ایک دوسری نہایت اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا یعنی یہ کہ اسلامی معاشرہ اور ریاست کا باقی انسانی معاشروں اور ریاستوں سے ربط و تعلق ان دو بنیادوں پر قائم ہو سکتا ہے جو پوری نوعِ انسانی کے مابین مشترک ہیں یعنی ۱۔ وحدتِ الٰہ اور ۲۔ وحدتِ آدم۔ اسی اہم حقیقت کو اجاگر کرنے کے لیے اس مقام پر تخاطب اس سورت کے عام اسلوب سے ہٹ کر بجائے "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کے "یَا اَیُّھَا النَّاسُ" سے ہوا (واضح رہے کہ قرآن حکیم میں سورۃ حجرات کی اس آیت مبارکہ کا مثنیٰ سورۃ نساء کی پہلی آیت ہے جس میں یہ تمام حقائق ایک عکسی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں)

۲۔ دوسری اہم بحث اسلام اور ایمان کے مابین فرق و تمیز کی وضاحت سے متعلق ہے!

واضح رہے کہ قرآن حکیم میں ایمان و اسلام اور مومن و مسلم کی اصطلاحات اکثر و بیشتر ہم معنی اور مترادف الفاظ کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اس لیے کہ واقعہ یہی ہے کہ یہ ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ اور ایمان انسان کی جس داخلی کیفیت کا نام ہے اسلام اُس کا خارجی ظہور ہے، لہٰذا جو انسان قلب میں ایمان و یقین کی دولت رکھتا ہو اور عمل میں اسلام اور اطاعت کی روش اختیار کرلے اسے "اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَہُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی" ایک انگریزی مقولے* کے مصداق چاہے مومن کہہ لیا جائے چاہے مسلم بات ایک ہی ہے۔ بخلاف اس مقام کے کہ یہاں ایمان و اسلام کو ایک دوسرے کے مقابل لایا گیا ہے اور ایمان کی نفیٔ کامل کے علی الرغم اسلام کا اثبات کیا گیا ہے۔

اس مقام پر اس بحث کے لانے کا اصل مقصد یہ ہے کہ یہ اہم اور بنیادی حقیقت واضح ہوجائے کہ اسلامی معاشرے میں شمولیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کی بنیاد ایمان پر نہیں ہے بلکہ اسلام پر ہے اس لیے کہ ایمان ایک باطنی حقیقت ہے جو کسی قانونی بحث و تفتیش اور ناپ تول کا موضوع نہیں بن سکتی۔ لہٰذا مجبوری ہے کہ دنیا میں بین الانسانی معاملات کو صرف خارجی رویّے کی بنیاد پر استوار کیا جائے جس میں ایمان کا زیادہ سے زیادہ صرف "اِقْرَارٌ بِاللِّسَان" والا پہلو شامل ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس بحث سے دو مزید عظیم حقائق کی جانب رہنمائی ہوگئی۔

ایک: یہ کہ انسان کی ایک ایسی حالت بھی ممکن ہے کہ اس کے دل میں نہ تو مثبت و ایجابی طور پر ایمان ہی متحقق ہو نہ منفی و سلبی طور پر نفاق۔ بلکہ ایک خلا کی سی کیفیت ہو لیکن اس کے عمل میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت موجود ہو۔ اس حال میں اگرچہ اس قاعدہ کلیہ کی رُو سے کہ بغیر ایمان انسان کا کوئی عمل بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں ہو سکتا یہ چیز بھی مبنی بر عدل ہی ہوتی کہ ایسی اطاعت قبول

* "Call the Rose by any name: It will smell as Sweet"

نہ کی جاتی لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل وکرم ہے جس کی جانب اشارہ دو اسمائے حسنیٰ غفورؔ اور رحیمؔ سے کر دیا گیا) کہ اس اطاعت کو بھی سندِ قبول عطا فرما دی گئی۔ (واضح رہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے آخری دور میں جب "وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا" کی صورت ہوئی تو اس وقت بھی بہت سے لوگوں کے ایمان و اسلام کی نوعیت یہی تھی اور بعد میں تو ہر دور میں امتِ مسلمہ کے سوادِ اعظم کا حال یہ رہا ہی ہے!)

دوسرے یہ کہ حقیقی ایمان کی بھی ایک جامع و مانع تعریف بیان ہو گئی، اور واضح کر دیا گیا کہ فی الحقیقت ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسے پختہ یقین کا جس میں شکوک و شبہات کے کانٹے چبھے نہ رہ گئے ہوں اور جس کا اوّلین اور نمایاں ترین عملی مظہر جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی یہ کہ انسان ہدایتِ آسمانی کی نشر و اشاعت اور حق کی شہادت، اور اللہ کے دین کی تبلیغ و تعلیم اور اس کے غلبہ و اظہار کے لیے جان و مال سے کوشش کرے اور اس جد و جہد میں تن من دھن سب قربان کر دے۔ آیت کے آخر میں مزید کھول دیا گیا کہ صرف ایسے ہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔

سورۂ حجرات کی اس آیہ کریمہ (إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ) پر گویا کہ ہمارے منتخب نصاب کا جزو ثانی ختم اور جزو ثالث شروع ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ سورۃ العصر میں بیان شدہ چار لوازمِ نجات کو اس آیت میں دو اصطلاحات میں جمع کر دیا گیا ہے ایک ایمانِ حقیقی جو جامع ہے ایمانِ قولی اور عملِ صالح دونوں کا اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جو جامع ہے تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا چنانچہ یہیں سے تواصی بالحق کی تفصیلی بحث کا آغاز ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ دوسرے ایمانیات ان کے ذیل میں آپ سے آپ مندرج ہو گئے۔

سانحۂ ارتحال

پرچہ پریس میں جا ہی رہا تھا کہ یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ ہمارے قابلِ احترام بزرگ اور رکن ادارہ تحریر محترم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے بڑے صاحبزادے حبیب میاں جمعہ ۲۹ جولائی کو مختصر علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ قارئین سے التماس ہے کہ مرحوم کی مغفرت کے لیے تہِ دل سے دعا کریں اور شیخ صاحب کے لیے بھی خصوصی دعا کریں کہ اللہ انہیں اس پیرانہ سالی میں اتنے بڑے صدمے کو برداشت کرنے کی ہمت اور صبر عطا فرمائے اور انہیں صحت کاملہ سے نوازے۔ جملہ وابستگانِ ادارہ اس غم میں محترم شیخ صاحب کے برابر کے شریک ہیں۔ (ادارہ)

امیر تنظیم اسلامی کے

بعض ذاتی اور خاندانی کوائف

اُن کے اپنے قلم سے!

(قسطِ دوم)

اواخر ۶۵ء سے اواخر ۷۰ء تک پانچ سال کا عرصہ راقم کی زندگی کا مصروف ترین اور شدید ترین مشقت کا دور تھا۔ جس کے دوران مختلف ہی نہیں متضاد قسم کی مصروفیات کا شدید دباؤ راقم پر رہا۔

یادش بخیر، محنت و مشقت کی شدت کے اعتبار سے ان ایّام کا مقابلہ اگر کسی درجہ میں کر سکتے ہیں تو صرف ۵۰ء تا ۵۳ء کے وہ تین چار سال جو اسلامی جمعیتِ طلبہ کے ساتھ انتہائی فعّال وابستگی میں گزرے تھے، اور جن کے دوران اولاً میڈیکل کالج کی نظامت، پھر لاہور اور پنجاب کی دوہری نظامت اور بالآخر پورے پاکستان کی نظامت علیا کا بوجھ راقم کے کندھوں پر رہا تھا۔[1]

---

[1] اس زمانے میں اللہ تعالیٰ نے جس قدر محنت اور مشقت کی توفیق عطا فرمادی تھی اس کا کسی قدر اندازہ جنوری ۱۹۵۲ء کے ایک دن کی روداد سے ہو سکتا ہے۔ ان دنوں میں اسلامی جمعیت طلبہ پنجاب کے ناظم کی حیثیت سے پنجاب کا طوفانی دورہ کر رہا تھا۔ اور اسی سلسلہ کی ایک کڑی سیالکوٹ کا ایک روزہ سفر تھا جس میں تین ہائی سکولوں اور دو کالجوں میں تقریروں کا پروگرام تھا۔ اس زمانے میں سڑکیں بہت خراب تھیں اور ٹرانسپورٹ بھی ابھی بالکل دقیانوسی حالت میں تھی۔ چنانچہ لاہور سے سیالکوٹ کا اسّی میل کا سفر ساڑھے تین چار گھنٹے میں طے ہوتا تھا۔ اور رات کو بسیں بالکل نہیں چلتی تھیں۔ لہٰذا لاہور سے ایک جونیئر ساتھی نذیر احمد خالد کی ہمراہی میں خالی پیٹ منہ اندھیرے روانگی ہوئی۔ سیالکوٹ پہنچتے ہی ساتھیوں نے بتایا کہ ایک ہائی سکول میں تقریر کا جو وقت طے ہوا تھا وہ ہو چکا ہے اور وہاں طلبہ اسمبلی کی صورت میں جمع ہیں اور شدت کے ساتھ انتظار ہو رہا ہے۔ لہٰذا کسی ناشتے وغیرہ کے بغیر سیدھے وہاں پہنچے۔ طے یہ تھا کہ سکولوں میں تقریر نذیر خالد صاحب

(باقی حاشیہ اگلے صفحے پر)

شدید مشقت کے اس دور ثانی (۶۵ء تا ۷۰ء) کی مصروفیات کا کسی قدر اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ:

ایک جانب مطب کی مصروفیت تھی جس میں صبح سے شام تو ہوتی ہی تھی، اس پر مزید یہ کہ چونکہ رہائش اور مطب یکجا تھے، لہٰذا رات کا آرام بھی یقینی نہ تھا۔ اور اکثر "تہجد بالرضیٰ" کی صورت پیش آتی رہتی تھی۔

دوسری جانب حلقہ ہائے مطالعہ قرآن، تھے جو لاہور کے مختلف گوشوں میں قائم تھے اور جن سے ہفتے کی کوئی شام مستثنیٰ نہ تھی۔ ان میں سے جو حلقے دور دراز کے علاقوں میں قائم تھے وہ تو مریضوں کی یلغار سے محفوظ رہتے تھے، لیکن جو دو حلقے خود کرشن نگر میں قائم تھے ان کے ضمن میں تو اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ادھر میں درس دے رہا ہوتا تھا اور ادھر دروازے پر مریض یا ان کے لواحقین منتظر ہوتے تھے۔ شام کے ان دروس پر مستزاد تھا جمعہ کا خطبہ و خطاب اور اتوار کی صبح کا مرکزی درس قرآن! گویا ہفتے کا کوئی پورا دن تو کجا، دن کا کوئی حصہ بھی آرام کے لئے مختص نہ تھا!

تیسری جانب تحریر و تسوید کا کام تھا۔ جس میں "میثاق" کے اداریوں کے علاوہ اپنے دعوتی مضامین اور کتابچوں کی تالیف بھی شامل تھی۔

اور چوتھی جانب اور ان سب سے بڑھ کر پریشان کن تھا "دار الاشاعت الاسلامیہ" کا

(حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کریں گے اور کالج میں راقم کرے گا لیکن انہوں نے جیسے ہی تقریر شروع کی ان کی آواز بھی بھرا گئی اور ٹانگیں بھی کانپنے لگیں۔ چنانچہ وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ: "باقی تقریر اسرار صاحب کریں گے!" چنانچہ اس روز راقم نے چار تقریریں کیں، تین ہائی سکولوں میں اور ایک جناح اسلامیہ کالج میں۔ (غنیمت ہے کہ مرے کالج اس روز کسی سبب سے بند تھا۔) ان تقاریر کے دوران بھی کچھ کھانے پینے کی نوبت نہیں آئی بلکہ ایک جگہ سے فارغ ہوتے ہی بھاگم بھاگ دوسری جگہ جانا ہوتا رہا۔ اور جیسے ہی یہ جناح اسلامیہ کالج کی تقریر سے فارغ ہو کر نکلے، ہمیں بتایا گیا کہ لاہور کے لئے آخری بس کا وقت ہو گیا ہے۔ چنانچہ فوراً روانگی ہو گئی..... اور رات کو جب دیر گئے لاہور پہنچے تو ہاسٹل کا میس (MESS) بند ہو چکا تھا..... لہٰذا وہ رات بھی فاقے ہی سے بسر ہوئی (نذیر خالد صاحب ہاسٹل کی بجائے اپنے بھائی صاحب کے گھر پر رہتے تھے، لہٰذا شاید کہ انہیں واپسی پر کچھ دستیاب ہو گیا ہو۔)

انتظامی کھکھیڑ۔ جس میں خوشنویس حضرات کا تعاقب' کاغذ کی مارکیٹ سے رابطہ' مطابع کے چکر' دفتری اور جلد ساز حضرات کے ساتھ "سرد و گرم" معاملات' پھر پرچے اور کتابوں کی ترسیل' ڈاک کی دیکھ بھال اور سب سے بڑھ کر حسابات کا اندراج ایسے مشقت طلب اور خالص "غیر رومانوی" قسم کے کام شامل تھے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اب سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس وقت یہ تمام کام میں تن تنہا کر رہا تھا..... اور اس پورے کام میں میرے صرف دو معاون تھے۔ ایک مطب کا ڈسپنسر اور دوسرے "دارالاشاعت" کے ایک جزوقتی کارکن!

الغرض..... ان پانچ سالوں کے دوران صورت بالکل وہ رہی جس کا نقشہ حضرت حسرت نے اپنے اس شعر میں کھینچا ہے۔

ہے مشقِ سخن جاری' چکّی کی مشقت بھی
اک طُرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

بہرحال..... سورۃ النجم کی آیات مبارکہ "لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ○ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی ○" میں بیان شدہ قانون خداوندی کے مطابق اس محنت و مشقت کا یہ نتیجہ تو ضرور برآمد ہوا کہ نہ صرف یہ کہ جماعت اسلامی سے لگ بھگ دس برس قبل علیحدہ ہونے والے لوگوں میں سے بہت سوں کے باطن میں دبی ہوئی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ چنانچہ ۶۷ء میں 'تنظیم اسلامی' کی تأسیس کے ضمن میں ایک اہم اجتماع بھی ہوا۔ (اگرچہ یہ کوشش بھی ع "خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود" کے مصداق ناکامی سے دوچار ہوگئی) بلکہ ہم خیال لوگوں کا ایک بالکل نیا حلقہ بھی وجود میں آگیا اور اس طرح ایک نئی تحریک کی داغ بیل پڑ گئی' لیکن اس کے ساتھ دو بحران بھی پیدا ہو گئے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

چنانچہ..... ایک جانب صحت متاثر ہونی شروع ہوئی اور اوائل ۷۰ء میں تو اس نے گویا بالکل جواب دے دیا۔ نتیجۃً مستقل طور پر حرارت رہنے لگی جو شام کے وقت باقاعدہ بخار کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ جیسے کہ عام طور پر ہوتا ہے' اولاً میں نے اس کی جانب توجہ ہی نہ کی' اور درد اور بخار کو دفع کرنے والی ادویات کے سہارے اپنے معمولات جاری رکھے۔

لیکن جب ایک دوبار تھوک میں خون کی آلائش بھی نظر آئی تو سنجیدگی کے ساتھ متوجہ ہونا پڑا۔ متعدد بار ایکسرے کرانے کے باوجود پھیپھڑوں میں تو کوئی واضح خرابی نظر نہ آئی۔ لیکن شام کے بخار اور ہلکی ہلکی کھانسی کے پیش نظر اکثر مخلصین کا اصرار تھا کہ ٹی بی کا علاج شروع کر دیا جائے..... وہ تو بھلا ہو ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کا کہ سختی کے ساتھ اڑ گئے کہ جب تک صریح اور مثبت شواہد نہیں ملیں گے میں ٹی بی کی ادویات استعمال کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔ انہی دنوں پروفیسر یوسف سلیم چشتی (مرحوم و مغفور) حکیم سعید احمد پھلواری (مرحوم) کو لے آئے۔ انہوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ پھیپھڑوں کے سرطان کی تشخیص کر ڈالی۔ چشتی صاحب ان کی "نباضی" کے بے انتہا معتقد تھے' لہٰذا اُن کے اصرار پر ایک کرم فرما کی وساطت سے ریلوے کیرن ہاسپٹل کے ڈاکٹر سعید صاحب سے باضابطہ "برانکو سکوپی" (BRONCHOSCOPY) کرانی پڑی جس کا نتیجہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ "پھیپھڑوں کی تمام نالیاں بالکل شیشے کے مانند صاف ہیں اور مجھے تو کہیں بلغم کی اتنی مقدار بھی نہیں ملی جسے خردبینی معائنے کے لئے نکال لاتا!"..... گویا یہ ثابت ہو گیا کہ یہ علالت نتیجہ تھی صرف جسمانی مشقت کی زیادتی' آرام کی کمی' اور اعصاب پر متضاد قسم کے کاموں کے شدید دباؤ کا!

دوسری جانب ابتدائی "فارغ البالی" کے کچھ ہی عرصے بعد مالی مشکلات نے سر اٹھانا شروع کر دیا..... اور رفتہ رفتہ اس اعتبار سے بھی صورت حال تشویش ناک ہوتی چلی گئی۔

کرشن نگر کے مکان کی خرید اور اس کی ابتدائی مرمت وغیرہ کے مصارف کے بعد جو سرمایہ میرے پاس بچا تھا' اس میں سے قدر قلیل کسی ہنگامی صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے محفوظ رکھ کر باقی کُل کا کُل میں نے "دارالاشاعت الاسلامیہ" میں کھپا دیا تھا۔ لیکن اس سے جو مطبوعات شائع ہو رہی تھیں' ظاہر ہے کہ وہ نہ تو "نرم و گرم نان" (HOT CAKES) کے مانند بکنے والی تھیں' نہ ہی چٹ پٹے ڈائجسٹوں کی طرح قبول عام حاصل کر سکتی تھیں' لہٰذا جلد ہی محسوس ہوا کہ کل سرمایہ منجمد (BLOCK) ہو کر رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ "تدبر قرآن" کی جلد دوم کی اشاعت کے لئے مجھے ایک دوست سے کچھ رقم حاصل کرنی پڑی۔ (جو انہوں نے قرض کی بجائے شراکت کی اساس پر دی' اور افسوس ہے کہ اس

وقت میں بھی اس شراکت کی پیچیدگیوں کو نہ سمجھ سکا۔ لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ صرف ایک کتاب کے سلسلے میں نفع ونقصان کی شراکت حساب کتاب کے اعتبار سے ناقابل عمل ہے۔ لہٰذا جیسے بھی بن پڑا میں نے جلد ہی ان کی رقم معذرت کے ساتھ واپس کر دی 'اگرچہ وہ اس پر کچھ جزبز بھی ہوئے۔)

جہاں تک میڈیکل پریکٹس کا تعلق ہے' میں اپنا سات آٹھ سال کا تعارف یا پیشہ ورانہ "نیک نامی" (GOOD WILL) کا سرمایہ تو منٹگمری (ساہیوال) ہی میں چھوڑ کر کراچی چلا گیا تھا۔ پھر لگ بھگ ساڑھے تین سال پریکٹس سے تقریباً لاتعلق رہا۔ مزید بر آں ان گیارہ سالوں کے دوران بہت سا پانی وقت کے دریا میں بہہ چکا تھا' اور ایک کثیر تعداد میں نوجوان ڈاکٹر میدان میں آ گئے تھے' ـــــ چنانچہ لاہور میں تو گلی گلی ایم بی بی ایس ڈاکٹروں کے مطب قائم ہو چکے تھے' ان حالات میں جان توڑ محنت سے بھی مطب بس اتنا ہی جم سکا کہ میری اور میرے اہل وعیال کی بقدر کفاف کفالت کر سکے...... جبکہ "دارالاشاعت" بھی مسلسل "ھل من مزید" کے نعرے لگا رہا تھا اور "میثاق" بھی ہر ماہ اچھے خاصے "خسارے کی سرمایہ کاری" کا متقاضی تھا!

الغرض وسط ۷۰ء تک صحت کی خرابی' اور مالی مشکلات دونوں نے مل جل کر ایک گھمبیر مسئلے کی صورت اختیار کر لی۔ اور اگرچہ داخلی طور پر تو یہ اطمینان حاصل رہا کہ بحمداللہ اپنے مقصد زندگی کی خاطر وہ صورت پیدا ہو گئی کہ ؎

خیریّتِ جاں' راحتِ تن' صحّتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی!

لیکن خارجی طور پر' عالم اسباب وعلل میں "پس چہ باید کرد؟" کا سوال پوری شدت کے ساتھ سامنے آ کھڑا ہوا۔

ان دنوں برادرم اقتدار احمد سے تو مکانی فصل وبُعد بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ ان کا کاروباری مرکز بھی کراچی میں تھا اور کاروباری سرگرمیاں بھی زیادہ تر اندرون سندھ تک محدود تھیں۔ مزید بر آں کاروباری علیحدگی کے بعد سے کچھ ذہنی اور قلبی حجابات بھی طاری ہو

گئے تھے، جن میں، جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، ان کے کاروبار میں نمایاں کامیابیوں اور ترقیوں سے پیدا شدہ مالی حیثیت کے فرق و تفاوت کی بنا پر بھی بہت کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

بڑے بھائی اظہار احمد صاحب نے اپنا رہائشی اور کاروباری مرکز جوہر آباد کو بنایا اور ان کے کاروبار کا دائرہ پنجاب اور سرحد میں پھیلا اور اُس میں بھی فوری طور پر بہت ترقی اور وسعت ہوئی۔ لہٰذا ان کی لاہور آمد و رفت کا سلسلہ بکثرت جاری رہتا تھا۔ انہوں نے میرے حالات کا اندازہ کر کے کچھ بڑے بھائی ہونے کے ناتے، کچھ نظریاتی اور مقصدی ہم آہنگی کے پس منظر کے باعث، اور کچھ کاروباری اشتراک اور پھر علیحدگی کے ضمن میں اپنی بعض زیادتیوں کی تلافی کی خاطر ۶۹ - ۱۹۶۸ء کے آس پاس مالی تعاون کی صورت پیدا کرنی چاہی..... لیکن میں نے کچھ طبعی غیرت اور کچھ ان کی متذکرہ بالا زیادتیوں کے شدید ردِّ عمل کے باعث ان کا کسی قسم کا تعاون قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

اس پر انہوں نے "زبردستی کے تعاون" کی بعض نہایت دلچسپ صورتیں اختیار کیں: مثلاً ایک یہ کہ "تدبر قرآن" کی جلد اوّل کے سو نسخے اپنی جیب سے پوری قیمت پر خرید کر بعض اعزّہ و احباب کو ہدیہ کر دیئے (حالانکہ ان میں سے اکثر کے بارے میں ہرگز کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس کا ایک لفظ بھی پڑھیں گے۔)

دوسرے یہ کہ میرے ذاتی فون سے لمبی لمبی کاروباری ٹرنک کالیں شروع کر دیں..... اور میں ابھی اسی شش و پنج میں تھا کہ یا اللہ! انہیں روکوں تو کیسے؟ اور نہ روکوں تو بل کیسے ادا ہو گا؟..... کہ انہوں نے دفعتہً کہہ دیا کہ اس فون کا پورا بل میں ادا کروں گا۔ اور اس پر میں سوائے خاموشی اختیار کرنے اور کچھ نہ کر سکا!

تیسرے یہ کہ اسی فون کی سہولت کے پیشِ نظر میرے مکان کے ایک کمرے میں اپنا لاہور آفس قائم کر دیا..... (واضح رہے کہ ان دنوں ٹیلی فون بہت کمیاب ہی نہیں تقریباً نایاب تھا اور مجھے بھی صرف مطب کی ترجیح کی بنا پر حاصل ہو گیا تھا)..... اور اس کے کچھ عرصے کے بعد "حسابِ دوستاں در دل" کے مطابق، گویا اس کے کرائے کے طور پر نہ صرف یہ کہ مکان کی بعض بوسیدہ چھتوں کو اپنی "تیار چھتوں" سے بدل دیا، بلکہ اُن کے دفتر کے باعث جو تنگی پیدا ہو گئی تھی اس کے ازالے کے لئے دوسری منزل پر کچھ اضافی تعمیر بھی کر دی۔ جس سے

مکان کی مالیت میں لامحالہ گرانقدر اضافہ ہو گیا۔

چوتھے یہ کہ جب میں نے 'میثاق' کے مالی خسارے کے ناقابل برداشت ہونے کا ذکر 'میثاق' ہی میں کیا تو انہوں نے فوراً پیشکش کر دی کہ اس کا کل خسارہ میرے ذمے رہے گا۔ یہ ایک بالکل نئی صورت حال تھی جس سے میں دفعتہً دوچار ہوا۔ اس لئے کہ اوپر کی متذکرہ جملہ صورتیں کچھ درپردہ اور بالواسطہ تعاون کی تھیں جبکہ یہ پیشکش کھلم کھلا اور براہ راست تعاون کی تھی۔ اور میں اپنی اُس ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اسے ٹھکرانے والا ہی تھا کہ اچانک میرے اندر ہی سے یہ آواز آئی کہ "تم 'میثاق' اللہ کے دین کی خدمت کے لئے شائع کر رہے ہو' اب اگر یہ مالی اسباب کی بنا پر بند ہو گیا تو تم اللہ کو کیا جواب دو گے اگر اللہ کی جانب سے یہ حجت قائم ہو کہ ہم نے تو اس کا ذریعہ پیدا فرما دیا تھا' تم نے اپنی ذاتی 'انا' کو کیوں مزاحم ہونے دیا؟" ..... بنابریں میں نے خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح بھائی جان کے "زبردستی کے تعاون" کا سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ جگر کے اس شعر کے مصداق کہ ؎

احساس خودی پر ہوتی ہے اک بوجھ نگاہِ لطف و کرم
جینا وہیں مشکل ہوتا ہے' مشکل جہاں آساں ہوتی ہے

بھائی جان کے اس زبردستی کے مالی تعاون سے میرے اعصابی دباؤ میں کمی کی بجائے اضافہ ہی ہوا۔ اس لئے کہ ایک تو میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی تھی اور دوسرے انہوں نے اپنی زیادتیوں کے اعتراف کے ساتھ معذرت نہیں کی تھی۔

موضوع گفتگو کی تکمیل کی خاطر یہ عرض کر دینا مناسب ہو گا کہ برادرم اقتدار احمد اور بھائی اظہار احمد صاحب کے علاوہ دونوں چھوٹے بھائی ابھی کسی شمار قطار ہی میں نہیں تھے۔ ان میں سے عزیزم ابصار احمد تو انگلستان میں زیر تعلیم تھے اور مالی اعتبار سے خود دوسروں کے زیر کفالت تھے۔ (اُن کی بیرونی تعلیم کے جملہ مصارف برادرم اقتدار احمد نے اپنے ذمے لے لئے تھے۔) البتہ اُن کے خطوط سے گاہ بگاہ ہمت افزائی بھی ہوتی رہتی تھی اور یہ اطمینان بھی حاصل ہوتا رہتا تھا کہ انہیں میں نے جس مقصد کے تحت فلسفہ کے رخ پر ڈالا تھا اور جس مقصد کی داغ بیل منٹگمری کے "دارالمقامہ" میں پڑی تھی اس کی جانب تسلی بخش پیش رفت ہو رہی

ہے۔ خصوصاً جب انہوں نے اپنے ایک خط میں یہ لکھا کہ: "جب سے یہاں (انگلستان) آیا ہوں "اسلام کی نشاۃ ثانیہ" کا مطالعہ چھ مرتبہ کر چکا ہوں اور ہر بار مجھے اس سے نئی رہنمائی حاصل ہوئی ہے!" تو خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی ہوا کہ انشاءاللہ وہ اُس مقصد کے لئے مؤثر خدمات انجام دے سکیں گے جس کا خاکہ اس کتابچے میں دیا گیا ہے..... رہے عزیزم وقار احمد تو وہ اگرچہ اولاً برادرم اقتدار احمد اور بعد ازاں بھائی اظہار احمد صاحب کے ساتھ کاروبار میں بالفعل شریک تھے..... لیکن کچھ عمر میں کم ہونے' اور کچھ طبعاً کم گو اور نرم مزاج ہونے کے باعث کسی معاملے میں مضبوط موقف اختیار نہیں کر سکتے تھے..... تاہم ان کی بھی ہمدردیاں مجھے ہمیشہ حاصل رہیں۔

وسط ۷۰ء تک ایک جانب تو' جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' متذکرہ بالا دونوں "بحران" اپنی پوری شدت کو پہنچ گئے تھے..... اور دوسری جانب ۷۰ء کے عام انتخابات کے حوالے سے ذاتی طور پر میرے لئے دو مزید پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں:۔

ایک یہ کہ بھائی اظہار احمد صاحب کے دل میں کچھ تو جماعت اسلامی کے ساتھ جذباتی لگاؤ نے دوبارہ زور پکڑا..... اور کچھ ملک اور قوم کی خدمت کے اُس جذبے نے انگڑائی لی جو بہت سے آسودہ حال لوگوں کے دلوں میں کچھ ملے جلے جذبات و محرکات کی بنا پر پیدا ہو جایا کرتا ہے..... چنانچہ انہوں نے انتخابات کی منجدھار میں چھلانگ لگا دی۔ اس سے ایک تو میرے اور اُن کے مابین زندگی میں پہلی بار نظریاتی بُعد پیدا ہو گیا جس کے نتیجے میں وہ حجابات جو پانچ سال کی مدت میں بمشکل کچھ کم ہونے پر آئے تھے نہ صرف یہ کہ دوبارہ قائم ہو گئے بلکہ پہلے سے بھی دبیز تر ہو گئے..... ثانیاً جب ان کی انتخابی مہم عروج کو پہنچی اور انہوں نے واقعتہً دیوانہ وار گاؤں گاؤں اور گلی گلی صدا لگانی شروع کی تو غالباً انہیں شدت کے ساتھ احساس ہوا کہ میرا ایک بھائی زبان اور قلم دونوں کی صلاحیتوں سے کسی قدر بہرہ ور ہونے کے ناتے میری اس مہم میں مؤثر مدد کر سکتا تھا' جو وہ نہیں کر رہا!..... اور واقعہ یہی تھا کہ میں اپنے نظریاتی موقف کے ہاتھوں مجبور ہونے کے باعث ان کی اس مہم سے قطعاً لاتعلق تھا۔ لہٰذا فطری طور پر ان کی طبیعت میں شدید ردِّ عمل پیدا ہوا..... اور کچھ اس بنا پر' اور کچھ اس وجہ سے کہ الیکشن کی شدید

مصروفیات کے باعث ان کے کاروبار کو بھی بڑا دھکا لگا تھا' اُن کی جانب سے "زبردستی کا تعاون" یکلخت بند ہو گیا۔ (اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عجیب حکمت مضمر تھی جس کا اندازہ بعد میں ہوا'..... چنانچہ اس کا تذکرہ بھی بعد ہی میں ہو گا! اور درحقیقت اسی کی وضاحت کے لئے راقم کو اپنے اور بھائی جان کے مابین معاملات کے اس ناخوشگوار حصّے کا ذکر کرنا پڑا..... ورنہ واقعہ یہ ہے کہ نہ صرف بڑے بھائی کی حیثیت سے' بلکہ تحریک اسلامی کے ساتھ اوّلین تعارف کا ذریعہ ہونے کے ناتے مجھ پر اُن کے بے شمار احسانات ہیں۔ اور میں اکثر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ اب جبکہ وہ دنیوی کامیابیوں اور کاروباری اور پیشہ ورانہ کامرانیوں سے حصّۂ وافر حاصل کر چکے ہیں۔ اور "مسنون عمر" کی بھی آخری حد کو چھو رہے ہیں اُن میں دین کے لئے دوبارہ وہی جوانی والا جوش و خروش اور جذبۂ عمل پیدا ہو جائے.....

وما ذلک علی اللّٰہ بعزیز!)

دوسرے یہ کہ جمعیت علماء اسلام نے جو ان دنوں مولانا مفتی محمود احمد مرحوم و مغفور کی زیر قیادت خاصی فعّال تھی مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کیا کہ میں اُن کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑوں۔ چنانچہ اس سلسلے میں دو بار مولانا محمد اجمل خاں اور علامہ خالد محمود صاحب میرے مطب (یا مکان) پر تشریف لائے۔ میں نے ان حضرات سے لاکھ عرض کیا کہ میں نے تو پالیسی کے اسی اختلاف کی بنیاد پر کہ الیکشن کے ذریعے پاکستان میں اسلامی نظام نہیں قائم کیا جا سکتا' جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تھی' اب میں کیسے الیکشن میں حصہ لے سکتا ہوں۔ لیکن اُن کی جانب سے اصرار جاری رہا..... ادھر کرشن نگر کے حلقے کی جماعت اسلامی کی ایک رسماً متفق لیکن عملاً سرپرست شخصیت' حاجی محمد لطیف (مرحوم و مغفور) نے ان حضرات کو میرے پاس آتے جاتے دیکھا تو یہ گمان کرتے ہوئے کہ شاید یہ حضرات کسی اور امیدوار کے لئے تعاون (SUPPORT) حاصل کرنے کی غرض سے چکر لگا رہے ہیں' پُر جلال انداز میں فرمایا: "اگر یہ لوگ ایسے ہی مخلص ہیں تو آپ کو کیوں نہیں کھڑا کرتے!" اس پر جب میں نے عرض کیا: "حاجی صاحب! وہ تو میرے پاس اسی لئے تشریف لائے تھے!" تو انہوں نے فوراً فرمایا کہ "اگر ایسا ہے تو میں ذمہ لیتا ہوں کہ جماعت اسلامی بھی آپ کے مقابلے میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں کرے گی۔ بلکہ آپ کو SUPPORT کرے گی!"

(واضح رہے کہ حاجی صاحب موصوف خود تو جماعت اسلامی کے علاقائی "سرپرست" تھے ہی۔ ان کے صاحب زادگان بھی اس ڈیو در یٹک یوتھ فورس کے چوٹی کے قائدین میں سے تھے جو اس وقت جماعت کی عوامی قوت کے اہم ترین ستون کی حیثیت رکھتی تھی...... چنانچہ ان کے ایک صاحب زادے "شوکت اسلام" کے جلوس میں مولانا مودودی مرحوم و مغفور کے محافظِ خصوصی کی حیثیت سے ان کے بالکل برابر ایستادہ رہے تھے!) اس پر میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا کہ: "حاجی صاحب! میرے پاس تو شاید ضمانت کے پیسے بھی نہ ہوں!" تو انہوں نے فرمایا کہ: "زرِ ضمانت بھی میرے ذمے رہا!"

اس پر' میں یہ انتہائی راز کی بات بتانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا کہ' میں نے اپنے اندر واقعتاً بالکل وہی کیفیت محسوس کی جو کسی انگریز آئی سی ایس افسر کے بارے میں بیان کی جاتی ہے کہ جب اسے کسی شخص نے رشوت پیش کی تو ابتدا تو اس نے اُسے شرافت اور ملائمت کے ساتھ رد کر دیا لیکن جب وہ شخص مسلسل اصرار بھی کرتا رہا اور رشوت کی رقم بھی بڑھاتا چلا گیا تو ایک خاص حد تک پہنچ جانے کے بعد اُس انگریز افسر نے اُس شخص کو نہایت سختی اور درشتی کے ساتھ حکم دیا کہ "میرے کمرے سے فوراً نکل جاؤ' اس لئے کہ اب تم 'میری قیمت' کے بہت قریب پہنچ گئے ہو!"...... چنانچہ میں نے بھی یہ اندیشہ شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ اگر یہ بات آگے بڑھی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے نفس کی گہرائیوں میں حُبِّ جاہ کی کوئی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے' اور میں بھی انتخابی سیاست کی دلدل میں پھنس کر ہمیشہ کے لئے اپنی منزل کھوٹی کر لوں...... بنابریں میں نے ملک سے راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت محسوس کی اور برادر عزیز وقار احمد کو کراچی فون کر دیا کہ میرے لئے عمرے کا بندوبست کریں تاکہ ایک تو میں انتخابات کے ہنگامے سے الگ تھلگ رہ سکوں۔ اور دوسرے حرمین شریفین کی پرسکون اور روح پرور فضا میں ٹھنڈے دل کے ساتھ غور و فکر کر کے اپنا آئندہ لائحہ عمل طے کر سکوں۔ عزیزم وقار احمد نے سوال کیا: "آپ کب جانا چاہتے ہیں؟" میں نے کہا: "تم کارروائی شروع تو کرو' میں تاریخ بھی جلد بتا دوں گا!"...... مجھے کیا پتہ تھا کہ کراچی میں یہ کام کس آسانی اور عجلت کے ساتھ ہو جاتے ہیں' انہوں نے دوبارہ کہا کہ آپ جب بھی جانا چاہیں گے انتظام ہو جائے گا!" اس پر میں نے تو گویا اپنے طور پر بہت

مشکل ذمہ داری اُن پر ڈال دی کہ: "میں تو ایک ہفتے کے اندر اندر روانہ ہو جانا چاہتا ہوں!" لیکن انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ: "بس آپ تیار ہو کر آ جائیں آپ جملہ انتظامات موجود پائیں گے!" اور واقعۃً جب میں چند دن کے اندر اندر وہاں پہنچا تو مجھے نہ صرف عُمرے کا ویزا' اور پی آئی اے کا چار ماہ کا رعائتی ٹکٹ تیار ملا..... بلکہ حفظانِ صحت کے ٹیکے بھی "لگے لگائے" مل گئے (یعنی بغیر ٹیکہ لگوائے مصدّقہ سرٹیفکیٹ حاصل ہو گیا!)..... یہ دوسری بات ہے کہ میں لاہور سے متعلقہ ٹیکے لگوا کر گیا تھا اور اس سفر میں میرے پاس دو ہیلتھ سرٹیفکیٹ تھے۔ ایک جعلی اور دوسرا اصلی۔

میرا یہ سفر جو لگ بھگ ۱۵/۱۶ر شعبان المعظّم سے ۱۷/۱۸ر ذی الحج ۱۳۹۰ھ تک پورے ایک سو بیس دن (یا تبلیغی بھائیوں کی اصطلاح میں تین چلّوں) پر محیط رہا' میری زندگی کا طویل ترین سفر بھی تھا اور ہر اعتبار سے اہم ترین بھی۔ اس لئے کہ اسی کے دوران' عین حج کے موقع پر' میں نے اپنی حیاتِ دنیوی کا اہم ترین فیصلہ کیا۔ یعنی میڈیکل پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد' اور جملہ صلاحیتیں اور توانائیاں' اور کُل اوقات وقف برائے نشر و اشاعتِ دعوتِ قرآن و سعیٔ اقامتِ دین و اعلاءِ کلمۃ اللہ!!

یہ فیصلہ جو اس وقت چند الفاظ میں بیان ہو گیا ہے' اُس وقت کئی ماہ کے مسلسل غور و فکر اور سوچ بچار کے بعد ہو سکا تھا' جس کے دوران ایک مرحلہ ایسا بھی آیا تھا کہ عقل و فہم کی جملہ صلاحیتیں ماؤف سی ہو گئی تھیں' حتیٰ کہ عارضی طور پر یادداشت بھی بالکلیہ زائل ہو گئی تھی! اور چند ساعتیں تو مجھ پر فی الواقع اس حال میں گزری تھیں کہ ؎

نہ ابتداء کی خبر ہے' نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں' سو یہ بھی کیا معلوم!

لہٰذا اس کے ضمن میں کسی قدر تفصیل مناسب ہے'..... لیکن اس سے قبل جی چاہتا ہے کہ کچھ تذکرہ اُن "فیوض الحرمین" کا ہو جائے جن سے راقم الحروف اس سفر کے دوران اپنی بساط اور ظرف کے مطابق بہرہ یاب ہوا۔ مزید برآں کچھ ذکر ان دلچسپ اور اہم حالات و واقعات کا بھی ہو جائے جو ان ایّام میں پیش آئے اور جن کی خوشگوار یادیں میری یادداشت کے محافظ

خانے میں حسین خوابوں کے مانند محفوظ ہیں۔ اس لئے کہ اس عرصے کے دوران جہاں متذکرہ بالا سوچ بچار کے ضمن میں "پیچ و تابِ رازی" کی کیفیت شدت کے ساتھ طاری رہی، وہاں حرمین شریفین کی حاضری کے صدقے "سوز و ساز رومی" کی کیفیت سے بھی بالکل محرومی نہیں رہی۔ اور اگرچہ یہ حالات و واقعات اِس تحریر کے مقصد سے براہ راست متعلق نہیں ہیں تاہم امید واثق ہے کہ جملہ رفقاء و احباب اور قارئین "میثاق" انہیں دلچسپ اور معلومات افزا بھی پائیں گے اور کسی قدر سبق آموزی کا ذریعہ بھی!

ان چار مہینوں کے دوران سب سے زیادہ کیف آور اور روح پرور "چلّہ" تو بلاشبہ وہ تھا جو مدینہ منوّرہ میں بسر ہوا۔ اس لئے کہ میں اواخر اکتوبر ۱۹۷۰ء میں عمرے کی سعادت حاصل کرنے اور چند دن مکّہ مکرّمہ میں قیام کرنے کے بعد (جہاں برادرم زبیر عمر صدیقی سے پہلی ملاقات ہوئی جو بعد کی بہت سی ملاقاتوں اور قریبی تعلقات کی تمہید بن گئی) شعبان کے آخری ایام میں مدینہ منوّرہ پہنچ گیا تھا۔ اور الحمدللہ کہ نہ صرف یہ کہ پورا ماہ رمضان مبارک وہیں بسر ہوا بلکہ شوال کا پہلا عشرہ بھی وہیں گزرا۔ اور اس طرح ایک چلّے سے کسی قدر زائد ہی قیام طیبہ کی سعادت نصیب ہوئی۔

اُن ایّام اور اُن کے دوران کی کیفیات کی یاد میرے لئے مستقل سرمایۂ حیات ہے..... مسلسل چالیس روز تک مسجد نبویؐ کی با جماعت نمازیں، صبح و شام مواجہہ شریف کی حاضری اور نبی اکرمؐ کے حضور ہدیۂ سلام پیش کرنے کی سعادت، پھر مسجد نبویؐ میں اِفطار کا کیف آور اور سرور انگیز منظر، پھر رات بھر مسجد نبویؐ کا کھلا رہنا اور بقعۂ نور بنے رہنا..... پھر تراویح میں حجازی لحن کے ساتھ ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھنے کا انداز، جس سے قرآن مجید خود بخود قلب و ذہن کی گہرائیوں میں جذب ہوتا چلا جائے اور اس کا نور باطن کو منوّر کرتا چلا جائے، پھر صلوٰۃ الوتر میں دعائے قنوت کا طول اور اس میں الحاح و زاری اور گریہ و بکاء کی کیفیات..... پہلی بیس راتوں کے دوران بھی تراویح کے بعد جا بجا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی صورت میں نوافل کی ادائیگی اور قرآن مجید کی وجد انگیز اور روح پرور قرأت، جس سے ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے پوری مسجد شب بیداری کر رہی ہو، اور آخری عشرے کے تو کیا ہی کہنے کہ تراویح کے بعد تھوڑا

ساوقفہ دے کر ڈھائی تین گھنٹے پر محیط "صلوٰۃ اللّیل" جس میں تین سواتین پارے روزانہ کے حساب سے ایک اضافی ختم قرآن ہوا' اور جس سے فراغت کے بعد بمشکل بھاگ دوڑ کر کے ہی سحری کی جاسکتی تھی۔

دن کے اوقات میں بھی فجر اور ظہر کے درمیان نفس کا کچھ حق استراحت ادا کرنے کے بعد ظہر تا عصر اور عصر تا مغرب "رَوْضَۃٌ من ریاض الجنہ" یا صفّہ کے چبوترے میں سے جہاں بھی جگہ مل جاتی مسلسل تلاوت قرآن کی سعادت حاصل رہتی اور اکثر آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ میری قرأت کو غور اور شوق کے ساتھ سنتے!..... الغرض ؎ "ہر روز روزِ عید تھا' ہر شب شبِ برات!"

طیبہ میں اُس ماہ رمضان کے دوران میرے قلب و نظر کو جو جِلا حاصل ہوئی اُس کا کماحقہ بیان و اظہار تو ناممکن ہے' صرف یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ورڈزورتھ کے ان اشعار کے مطابق کہ:

I gazed and gazed but little thought,
What wealth the scene to me had brought
For, off when on my couch I lie,
In vacant or in pensive mood.
They flash upon my inward eye,
Which is the bliss of solitude.
And then my heart with pleasure fills,
And dances with the daffodils.

میرا حال بھی یہ ہے کہ اُس کے بعد جب کبھی اس بھری دنیا میں تنہائی کا احساس شدّت اختیار کر لیتا ہے اور ایک انجانی سی اداسی اور افسردگی دل پر طاری ہو جاتی ہے تو کہیں قلب کی گہرائیوں سے طیبہ کے اُس رمضان مبارک کی کیفیات کا نشاط انگیز سرور ابھرتا ہے اور طبیعت میں ایک نیا انبساط اور انشراح پیدا ہو جاتا ہے..... مزید برآں' یہ بھی میرے قلب پر طیبہ کے اُسی رمضان مبارک کے گہرے نقش کا ثمرہ ہے کہ جیسے ہی قرآن اکیڈمی کی مسجد تیار ہوئی اس میں اولاً رمضانِ مبارک کے آخری عشرے کے قیام اللّیل کا اہتمام ہوا..... اور رفتہ رفتہ بات دورۂ

ترجمۂ قرآن تک جا پہنچی، جس کے دوران بحمد اللہ مسجد نبویؐ کی متذکرہ بالا کیفیات کا ایک ادنیٰ عکس "جامع القرآن" میں نظر آنے لگتا ہے، فلله الحمد و المنة

قصہ مختصر یہ کہ اگرچہ میرے لئے واضح طور پر یہ بتانا تو ممکن نہیں ہے کہ اُس رمضانِ مبارک کے دوران حرمِ مدنی کے کیا کیا فیوض مجھے حاصل ہوئے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی حسین یادیں میرے نہاں خانۂ قلب میں کچھ اس طرح پیوست ہو گئی ہیں کہ اگرچہ اس کے بعد ماہ مبارک اٹھارہ بار آ چکا ہے۔ (بقول نعیم صدیقی مدظلہ "اٹھارہ سال یونہی حسرتوں میں بیت گئے!") اور الحمدللہ کہ ہر سال رمضان مبارک کے فیوض و برکات سے بقدر ظرف کچھ نہ کچھ استفادہ ضرور ہوتا ہے تاہم حضرت جامیؒ کے الفاظ: مدظلہ "خدایا آں کرم بار دگر کن!" اور پیر مہر علی شاہؒ کے الفاظ: مدظلہ "شالا آون وت بھی اوہ گھڑیاں!" کے مصداق ہمیشہ دل سے اک ہُوک سی اٹھتی ہے کہ کاش وہ سعادت ایک بار پھر نصیب ہو جائے.....

اگرچہ کچھ اپنی مصروفیات کے باعث اور کچھ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اب وہاں رش بے پناہ ہوتا ہے امید کم ہی ہے کہ وہ کیف اور سرور کبھی "بار دگر" حاصل ہو سکے!

آخری عشرے میں مولانا سید محمد یوسف بنّوریؒ بھی اعتکاف کے لئے تشریف لے آئے تھے۔ اُن کا قُرب میرے لئے ویسے بھی "نافلۃً لک" کے مصداق ایک اضافی سعادت کا ذریعہ تھا۔ مزید برآں میں نے موقع کو غنیمت جانتے ہوئے اُن کی خدمت میں اپنا کتابچہ 'مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' پیش کیا کہ "میں اسے بڑے پیمانے پر شائع کرنا چاہتا ہوں، آپ زحمت فرما کر اس پر ایک نظر ڈال لیں اور کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو متنبہ فرما دیں"..... اور میں اسے اپنے اور اپنی قرآنی تحریک پر اللہ تعالیٰ کے فضل کا مظہر سمجھتا ہوں کہ مولانا رحمہ اللہ نے اس کتابچے کا مطالعہ بحالتِ اعتکاف فرمایا..... اور صرف ایک جملے میں لفظی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ جس کی میں نے آئندہ ایڈیشن میں تعمیل کر دی۔

مدینہ منوّرہ میں میرا مستقل قیام مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کے مکان پر رہا۔ اور اگرچہ میں نے کئی بار درخواست کی کہ وہ مجھے اجازت دے دیں کہ میں کسی ہوٹل وغیرہ میں منتقل ہو جاؤں لیکن انہوں نے کمالِ شفقت سے اپنے ہی پاس مقیم رکھا۔ اور اس حقیقت کا ذکر نہ کرنا

ناشکری کے ذیل میں آئے گا کہ لگ بھگ ڈیڑھ ماہ کے مسلسل قیام کے باوجود ان کی جانب سے تواضع اور مہمان نوازی میں ہرگز کوئی کمی نہیں آئی بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس میں ترقی ہی ہوتی چلی گئی۔

ان کے صاحب زادے برادرم صہیب حسن بھی جو جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ سے فراغت کے بعد اُن دنوں سعودی حکومت کی جانب سے مشرقی افریقہ میں "مبعوث" اور تعلیمی و تبلیغی خدمت میں مشغول تھے' اپنی سالانہ تعطیلات پر مدینہ منوّرہ آ گئے تھے۔ (آج کل وہ یہی خدمات انگلستان میں سرانجام دے رہے ہیں) ۔ ان کی رفاقت اور معیت بھی اس پورے عرصے کے دوران میرے لئے ازبس غنیمت ثابت ہوئی۔ بلکہ اُن کی ہمراہی میں ایک دو روزہ یادگار سفر الریاض کا بھی ہوا۔ جس کے دوران حجاز اور نجد کے مابین تمدن و ثقافت کے نمایاں فرق و تفاوت کا علم حاصل ہوا۔ اللہ تعالیٰ مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ اور برادرم صہیب حسن دونوں کو اس مہمان نوازی اور خاطر مدارات کا اجر جزیل عطا فرمائے۔

الحمدللہ کہ راقم ہرگز کسی مغالطے یا خبط میں مبتلا نہیں ہے اور اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ ان نفوسِ قدسیہ کے قافلے کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا جو براہ راست تحدیث الٰہی اور بشاراتِ ربّانی سے مشرّف ہوتے ہیں۔ تاہم اپنے قیام طیبہ کے دوران بعض بالواسطہ بشارتیں راقم کو حاصل ہوئیں جن کا تذکرہ محض تحدیثاً للنعمہ کیا جارہا ہے:۔

۱۔ ایک روز مجھے مسجد نبویؐ میں بعض حضرات نے بتایا کہ ایک بزرگ تمہیں بڑے والہانہ انداز میں تلاش کر رہے تھے۔ انہوں نے مُسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق' کا مطالعہ کیا ہے اور جب سے انہیں معلوم ہوا ہے کہ تم ان دنوں یہاں آئے ہوئے ہو ملاقات کے لئے بہت بیتاب ہیں..... اگلے روز میں باب مجیدی سے مسجد نبویؐ میں داخل ہو ہی رہا تھا کہ کسی کی نشاندہی پر وہ بزرگ دوڑ کر میرے پاس آئے اور نہ صرف یہ کہ نہایت گرمجوشی کے ساتھ معانقہ کیا بلکہ میری پیشانی اور داہنے ہاتھ کو بوسہ بھی دیا۔ اور اس کے ساتھ جو الفاظ کہے وہ نقل نہیں کئے جاسکتے! ادھر میں اتنا خجل اور محجوب تھا کہ نگاہ بھر کر ان کے چہرے کو دیکھ بھی نہ سکا..... تاہم دل کو بہت مسرت حاصل ہوئی کہ اس کتابچے کی اس انداز میں مدینہ منورہ میں

پذیرائی مجھ ایسے شخص کے لئے یقیناً بہت بڑی بشارت ہے[1]!

۲۔ اسی طرح ایک روز میں اشراق کے بعد سویا ہوا تھا کہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے ایک ملاقاتی تشریف لے آئے۔ اور چونکہ میرا قیام مولانا کے مکان کی بیٹھک ہی میں تھا اور مولانا نے وہیں ان کا استقبال کیا لہٰذا میری بھی آنکھ کھل گئی۔ تاہم میں چادر اوڑھے اس انتظار میں لیٹا رہا کہ جیسے ہی وہ صاحب رخصت ہوں میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا جاؤں..... کہ اچانک ان کی ایک بات نے مجھے اپنی جانب متوجّہ کر لیا..... وہ مولانا سے کہہ رہے تھے کہ "مولانا! دو ماہ قبل میں لاہور گیا تھا۔ وہاں میں نے ۲۷ رجب کی شب کو ایک مسجد میں معراج النبیؐ کے موضوع پر ایک تقریر سنی....." اس کے بعد جو تحسین آمیز کلمات انہوں نے کہے انہیں بھی نقل کرنا مناسب نہیں ہے' البتہ اس پر بھی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ "بار الٰہا! کہاں میں اور کہاں میری تقریر کی ایسی پذیرائی کہ اُس کا تذکرہ ان شاندار الفاظ میں مدینۃ النبیؐ میں ہو رہا ہے!" گویا ؎ "اک بندہ عاصی کی اور اتنی مداراتیں!" اور ؎ "یہ نصیب' اللہ اکبر' لوٹنے کے جائے ہے!"..... بعد میں معلوم ہوا کہ وہ صاحب کراچی کے مشہور ڈینٹل سرجن اور نامور مذہبی و سماجی کارکن ڈاکٹر الٰہی علوی مرحوم کے چھوٹے بھائی تھے' جن کا خاصا بڑا کاروبار صدر' کراچی میں ہے!..... میں نے اپنی اُسی طبعی مجوبیت کی بنا پر نہ اس وقت اُن سے تعارف حاصل کیا' نہ ہی مولانا کو یہ بتایا کہ یہ میری تقریر کا تذکرہ تھا..... البتہ بعد میں اُن سے تعارف بھی ہوا اور وہ میرے کراچی کے دروس و خطابات میں ذوق و شوق کے ساتھ شرکت بھی فرماتے رہے!

---

[1] میرے ساتھ اسی نوعیت کا "حادثہ" نومبر ۱۹۵۳ء میں کراچی میں بھی ہوا تھا کہ جب میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جہانگیر پارک میں ڈاکٹر عمر ملک کے زیر صدارت منعقدہ جلسۂ عام میں "طلبہ کے مسائل اور ان کا حل" کے موضوع پر ایک گھنٹہ چالیس منٹ کی تقریر کر کے ڈائس سے اترا تو ایک سفید ریش بزرگ نے جو ایک جانب کھڑے ہوئے تھے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور نہایت جذباتی انداز میں سینے سے لگا کر فرمایا: "عزیزم! آپ جتنی دیر وہاں کھڑے تقریر کرتے رہے ہیں' میں آپ کی جگہ مولانا مودودی کو دیکھتا رہا ہوں!" (واضح رہے کہ مولانا مودودی مرحوم ان دنوں ملتان جیل میں نظر بند تھے)۔

اُن دنوں کی چند اور ملاقاتوں کا ذکر بھی مناسب معلوم ہوتا ہے :۔

۱۔ عید الفطر کے روز سعودی عرب کے مختلف شہروں میں مقیم جماعت اسلامی کے چند احباب راؤ محمد اختر صاحب کی معیت میں مولانا عبدالغفار حسن سے ملاقات کے لئے تشریف لائے تو چونکہ میں بھی وہیں مقیم تھا لہٰذا مجھے بھی اس ملاقات میں شمولیت کا "شرف" حاصل ہوا..... چونکہ اس وقت پاکستان کے (دسمبر ۷۰ء کے) عام انتخابات بالکل سر پر تھے' لہٰذا گفتگو ان ہی کے بارے میں ہوتی رہی اور سب حضرات اپنے اپنے تخمینے اور اندازے بیان کرتے رہے۔ اکثر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ جماعت اسلامی کو مرکزی اسمبلی کی کم از کم ساٹھ نشستیں مل جائیں گی۔ زیادہ محتاط حضرات بھی کم از کم تیس چالیس کے بارے میں تو یقین کامل رکھتے تھے۔ ادھر میں جان بوجھ کر خاموشی اختیار کئے ہوئے تھا۔ کہ اچانک راؤ صاحب نے (واضح رہے کہ وہ جمعیت طلبہ کے زمانے میں ہمارے "برخورداروں" میں شامل تھے!) مجھ سے براہ راست سوال کر دیا کہ : "ڈاکٹر صاحب آپ کی رائے کیا ہے؟" میں نے عرض کیا کہ : "میری بات آپ حضرات کو پسند نہیں آئے گی' لہٰذا اصرار نہ فرمائیں!"..... لیکن جب ان کی جانب سے شدید اصرار ہوا تو میں نے عرض کیا کہ : "میرے نزدیک مغربی پاکستان میں تو آپ حضرات کو صرف چار یا پانچ سیٹیں ملیں گی۔ البتہ مشرقی پاکستان میں آٹھ سے دس تک کا معاملہ ہو سکتا ہے!"..... اس پر ایک زور دار قہقہہ بلند ہوا۔ اور سب نے کہا کہ "ڈاکٹر صاحب' کم از کم تیس سیٹوں کے بارے میں تو ہمارے دشمنوں کا بھی یہ خیال ہے کہ ہمیں بہر صورت مل کر رہیں گی!"..... جس پر میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا کہ : "آپ مجھے خواہ دوست سمجھیں' خواہ دشمن' بہر حال میری رائے یہی ہے جو میں نے عرض کر دی!"

چند ہی دنوں کے بعد الیکشن ہوا اور اس کے نتائج وہیں مدینہ منوّرہ میں مولانا عبدالغفار حسن کی اسی بیٹھک میں سنے تو راقم خود حیران و ششدر رہ گیا کہ مغربی پاکستان کی حد تک تو میری رائے حرف بحرف درست ثابت ہوئی۔ اس لئے کہ براہ راست جماعت کے ٹکٹ پر تو چار ہی امیدوار کامیاب ہو سکے تھے' پانچویں مولانا ظفر احمد انصاری تھے جو آزاد امیدوار کی حیثیت میں' لیکن جماعت اسلامی کی سپورٹ ہی کی بنیاد پر کامیاب ہوئے تھے!..... مشرقی پاکستان

کے بارے میں بھی میری رائے صحیح ہی ثابت ہوئی تھی اس لئے کہ ووٹوں کی تعداد سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہاں جماعت کا معاملہ مغربی پاکستان کے مقابلے میں کم از کم دوگنا بہتر رہا تھا۔ اگرچہ سائکلون کی تباہی سے پیدا شدہ اثرات اور اس کے ضمن میں بی بی سی کے گمراہ کن پروپیگنڈے نے نتائج کو بالکل الٹ کر رکھ دیا تھا!

۲ - عید کے دوسرے دن بخاری حضرات کی رباط میں مولانا بنّوریؒ سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو وہاں اچھی خاصی مجلس جمی ہوئی تھی۔ ادھر میں ایک ذاتی مسئلے میں مولانا سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتا تھا..... کافی انتظار کے بعد میں نے درخواست کر ہی دی کہ مجھے چند منٹ تخلیہ میں درکار ہیں۔ مولانا کمال شفقت و مروت سے وہاں سے اٹھ کر مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گئے..... وہاں میں نے عرض کیا کہ : "مولانا! میں بہت پریشان ہوں کہ میرا دل مسجد نبویؐ میں تو خوب لگتا ہے' مسجد حرام میں بالکل نہیں لگتا' اور ہزار کوشش کے باوجود وہاں یکسوئی حاصل نہیں ہوتی!" ..... میری بات سن کر مولانا پر دفعتہً رقّت طاری ہو گئی اور انہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا : "ڈاکٹر صاحب! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے ایک دینی و روحانی معاملے میں رہنمائی چاہی ہے۔ ورنہ ہمارے پاس جو بھی آتا ہے دنیا ہی کے مسائل و مشکلات کا رونا رونے آتا ہے۔" ساتھ ہی انہوں نے وعدہ فرمایا کہ وہ میرے لئے اپنے خصوصی اوقات میں صمیم قلب سے دعا کریں گے۔ میرے دل پر مولانا رحمۃ اللہ کے خلوص و اخلاص اور سادگی اور صاف گوئی کا بہت اثر ہوا۔ اور اس کے بعد میں اپنے کراچی کے دوروں کے مواقع پر حتی الامکان مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے اور اُن کی شفقت اور عنایت سے مستفید و مستفیض ہونے کی کوشش کرتا رہا..... اور خود مولانا نے بھی ایک بار اپنی دورۂ حدیث کی کلاس سے مجھے دعوت خطاب دے کر اور پھر میری درخواست پر پہلی سالانہ قرآن کانفرنس منعقدہ ۱۴ تا ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۳ء کے افتتاحی اجلاس میں شرکت فرما کر اور ایک شب میرے ہی غریب خانے پر قیام فرما کر میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ فجزاہ اللّٰہ احسن الجزاء۔

۳۔ مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کے مکان پر ایک یادگار ملاقات مولانا محمد علی لکھویؒ (والد ماجد مولانا محی الدین لکھوی و مولانا معین الدین لکھوی) سے ہوئی۔ جس کے دوران ایک تو مفصل گفتگو علم تفسیر پر ہوئی۔ جس سے اندازہ ہوا کہ مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ بھی اپنی

تمام تر وہابیت اور روایت پرستی کے باوجود کسی نہ کسی درجے میں سرسید احمد خاں مرحوم کے خیالات سے متاثر تھے..... اور دوسرے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ایک اہم اور عبرت انگیز واقعہ علم میں آیا۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ وہ علماء ہند کے اُس وفد میں شامل تھے جس نے ملک عبدالعزیز ابن سعود مرحوم سے جدہ میں ملاقات کی تھی تاکہ انہیں فتح حجاز پر مبارکباد بھی دے اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کرے کہ حرمین شریفین کو جملہ مسلمانانِ عالم کے لئے "کھلے شہر" قرار دے دیا جائے۔ مولانا نے بتایا کہ جب ہم لوگوں نے مبارکباد پیش کی تو شاہِ مرحوم سراپا عجز و تواضع بن گئے اور کہنے لگے کہ: "یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہم ایسے بادیہ نشینوں اور "اونٹ کا پیشاب پینے والوں" کو حرمین شریفین کی خدمت سونپ دی ہے!"..... لیکن جب ہم نے اپنا دوسرا مدعا بیان کیا تو بادشاہ کے تیور ایک دم بدل گئے اور ان کا ہاتھ بے اختیار تلوار کے دستے پر پہنچ گیا اور انہوں نے غیظ و غضب کے عالم میں ارشاد فرمایا: "کیا کہا؟ ہم نے حجاز کی حکومت بزورِ شمشیر حاصل کی ہے! اب اسے جملہ مسلمانان عالم کے حوالے کیوں کر دیں؟"..... اس سے اندازہ ہوا کہ آل سعود کے مزاج میں آغاز ہی سے نجدی مذہبیت کے ساتھ ساتھ دولت اور حکومت کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ (اس کا ایک نہایت تلخ مشاہدہ راقم کو اس سے قبل ۱۹۶۲ء میں اپنے پہلے حج کے موقع پر رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی اجلاس کے ضمن میں بھی ہو چکا تھا۔ لیکن اس کی تفصیل پھر کبھی سہی)

اپنے ذاتی مسئلے میں رہنمائی کے لئے میں نے مکہ مکرمہ میں طواف اور سعی کے دوران بھی قلب کی گہرائیوں سے دعائیں کی تھیں۔ اور پورے ماہ رمضان مبارک کے دوران بھی میں مسلسل دعا بھی کرتا رہا تھا۔ اور کسی قدر سوچ بچار بھی کرتا رہا تھا اور اگرچہ رمضان مبارک کی اپنی مصروفیات اور خصوصاً روحانی کیف و سرور نے مسئلے کے حل کی جانب زیادہ متوجہ ہونے کی مہلت نہیں دی تھی، تاہم تحت الشعور میں "پس چہ باید کرد؟" اور "To be or not to be is the Question" کی ادھیڑ بن دھیمے دھیمے انداز میں جاری رہی تھی!

رمضان مبارک کے اختتام پر ایک تو ویسے بھی ایک نوع کے Anti-climax کی سی

کیفیت لازماً پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ خلا کا سا احساس ہونے لگتا ہے اور ایک گونہ اداسی اور افسردگی سی طاری ہو جاتی ہے' اور طیبہ کے رمضان کے بعد تو یہ معاملہ بہت ہی نمایاں تھا.....

پھر پاکستان کے عام انتخابات میں تمام مذہبی جماعتیں جس طرح چاروں شانے چت ہوئی تھیں اور بڑے بڑے سیاسی اور صحافی پنڈتوں کی پیشین گوئیوں کے بالکل برعکس پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں خطوں میں خالص سیکولر مزاج کی حامل جماعتوں کو واضح اور مطلق اکثریت حاصل ہو گئی تھی' اس کا بھی دل و دماغ پر شدید اثر تھا۔ ایسے میں جب ذہن نے توجہ کے پورے ارتکاز کے ساتھ اپنے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا' اور ایک جانب معاش اور اہل و عیال' دوسری جانب دین اور اس کی دعوت و تحریک' اور تیسری جانب "عافیت جاں' راحت تن' صحت واماں" کے تلخ مگر سنگین حقائق ایک دم ذہن میں تازہ ہو گئے تو میں نے بالکل ایسے محسوس کیا جیسے میں پہاڑ تلے آ گیا ہوں۔

ایک بات تو اس عرصے کے کچھ شعوری اور کچھ غیر شعوری غور و فکر کے نتیجے میں بالکل قطعی اور دوٹوک انداز میں سامنے آ چکی تھی..... یعنی یہ کہ معاش و مطب اور دعوت و تحریک' دونوں کو میں جس انداز میں گزشتہ پانچ سال کے دوران ساتھ لے کر آگے بڑھتا رہا تھا وہ اب مزید جاری رہنا ناممکن تھا اور حالات ایک ایسے فیصلہ کن دوراہے پر آ پہنچے تھے کہ "یا چناں کن یا چنیں!" کے انداز میں ایک دوٹوک فیصلہ لازمی تھا۔

مجھے اپنے سامنے دو راستے واضح طور پر نظر آ رہے تھے جن میں سے کسی ایک کو ذہن و قلب کی کامل یکسوئی کے ساتھ اختیار کرنا اور دوسرے کو واضح شعوری فیصلے کے ساتھ ترک کرنا ناگزیر ہو گیا تھا:-

ایک یہ کہ مطب بند کر دوں۔ اور پریکٹس کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ کر اپنے آپ کو ہمہ تن اور ہمہ وقت دعوت اور تحریک کے لئے وقف کر دوں۔ اور معاش کے معاملے میں کُلّیتہً اللہ پر توکّل کروں اور اس یقین کا سہارا لوں کہ۔ "وَكَأَيِّنْ مِنْ دَآبَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○" (العنکبوت۔ ۶۰) ..... اور

دوسرے یہ کہ دعوت و تحریک کے ضمن میں جتنی پیش رفت ہو چکی ہے اس سے بھی کسی

قدر پسپائی اختیار کر کے اسے ایک سطح پر منجمد (SEAL) کر دوں' اور اپنی اصل توجہ کو مطب اور معاش پر مرتکز کر کے ثانوی درجے میں درس و تدریس کا کام جس قدر بھی ہو سکے اُس پر اکتفا کر لوں۔

پہلی بات کہنے میں جس قدر آسان تھی' واقعتہً اتنی ہی مشکل اور کٹھن تھی۔ اور اگرچہ بحمداللہ میرا ذاتی رجحان اسی کی جانب تھا لیکن یہ حقائق بھی پوری شدّت کے ساتھ پیش نظر تھے کہ مطب کے سوائے معاش کا کوئی ظاہری یا مرئی ذریعہ یا وسیلہ سرے سے موجود نہ تھا' چنانچہ نہ کوئی زمین تھی نہ جائداد' اور روئے ارضی پر میری کل "ملکیت" اُس مکان کی صورت میں تھی جس میں میں اور میرے اہل و عیال رہائش پذیر تھے' لہٰذا وہ بھی کسی آمدنی کا ذریعہ نہیں بن سکتا تھا رہی نقد پونجی تو وہ ایک قدر قلیل کے سوا سب کی سب "دارالاشاعت" کے اسٹاکس کی صورت میں جامد (BLOCK) ہو چکی تھی' دوسری جانب میں تنہا نہ تھا بلکہ نو دس افراد کے کنبے کا واحد کفیل تھا' پھر تا حال نہ کوئی جماعت تھی نہ تنظیم جس کی جانب سے "کفاف" کی توقع کی جا سکے۔ رہا خاندان' تو اس کا شیرازہ بھی بالکل منتشر ہو چکا تھا اور صورت بالکل وہ بن چکی تھی کہ ؎ "دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا!" ..... الغرض' یہ تمام تلخ مگر سنگین حقائق مجھے اپنے سر پر بالکل "و رفعنا فوقکم الطور" کی سی کیفیت کے ساتھ معلق نظر آ رہے تھے۔ اور ان سب پر مستزاد' اور بعض پہلوؤں سے ان سب سے مشکل سوال یہ تھا کہ اگر ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

کے مصداق ان تمام حقائق و واقعات کو نظر انداز کر کے چھلانگ لگا دی جائے تو آیا یہ دین اور شریعت کی رو سے جائز بھی ہو گا یا نہیں؟

رہی دوسری صورت تو یہ آسان بھی تھی اور دنیا کے عام دستور اور چلن کے موافق بھی..... لیکن مجھے یہ صریحاً "خودکشی" کے مترادف نظر آتی تھی۔ اس لئے کہ میں نے پورے بیس سال قبل اٹھارہ برس کی عمر اور نیم شعوری کے دور میں "فرائض دینی" کے ایک خاص تصور کے مطابق اپنی زندگی کا ایک رخ متعین کر کے سفر کا عملاً آغاز کر دیا تھا۔ پھر جیسے

جیسے معلومات میں اضافہ ہوا' اور شعور میں پختگی پیدا ہوتی گئی اس تصور اور رخ کے بارے میں اعتماد اور یقین میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا اور جب قرآنِ حکیم اور سنت و سیرتِ رسول (صلی اللہ علیہ و سلم) تک براہ راست رسائی ہوئی تب تو "وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ" کے مصداق پورا انشراح اور اطمینان حاصل ہو گیا کہ۔ ہمہ جا ایں جا است! " اور "اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ حَقُّ الْیَقِیْنِ" ...... پھر اس ذہنی اور قلبی انشراح کے ساتھ ساتھ بحمد اللہ عملی پیش قدمی بھی جاری رہی تھی۔ چنانچہ زمانہ طالب علمی میں اسی تصور کے حسن معنی کے خاطر خوب سوچ سمجھ کر اور پورے شعوری طور پر اپنے تعلیمی اور پیشہ ورانہ کیریئر کی قربانی کا فیصلہ کیا تھا۔ اور مسلسل بیس برس تک بفضلہ تعالیٰ جسم و جان کی بہتر اور بیشتر توانائیاں اِسی رخ پر صرف کئے رکھی تھیں۔ (اس میں جو ذرا سی کمی اُن تین سالوں کے دوران آئی تھی جو مشترک خاندانی کاروبار میں شمولیت کی صورت میں بسر ہوئے' تو اس کا اصل سبب بھی "سیر عن اللہ الی اللہ" کے مانند اسی مقصد زندگی کے نام پر دی جانے والی دعوت کے سوا کچھ نہ تھا۔)
اور بحمد اللہ اُس وقت تک میرا ضمیر بالکل مطمئن تھا کہ بفضلہ تعالیٰ میں نہ صرف یہ کہ ؎

"واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریّتِ جاں' راحتِ تن' صحّتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہل ہوس کی"

کے معیار پر پورا اترا تھا...... بلکہ میں نے اپنے تصوّرات و معتقدات اور زندگی کے رُخ اور مقصد کے خاطر "غیروں" کے "ناوکِ دشنام" کے وار بھی خوشدلی سے سہے تھے اور "اپنوں" کے "طرز ملامت" کی بھی ہر ادا کو برداشت کیا تھا۔ اور جہاں اپنے موقف کی صحت کے یقین کی بنیاد پر دشمنوں سے جنگیں لڑی تھیں وہاں اپنے ضمیر کی آواز پر لبّیک کہتے ہوئے دوستوں اور بزرگوں سے بھی لڑائی مول لی تھی...... لیکن مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس سب کے بعد اگر اب' جبکہ مجھ پر اللہ کا مزید کرم یہ ہو گیا تھا کہ اسؔ اللہ نے اپنی کتابِ حکیم کے ساتھ قلبی اُنس اور ذہنی مناسبت عطا فرمادی تھی اور نہ صرف یہ کہ اس کے فہم کے لئے میرے ذہن و قلب کے دروازے کھول دیئے تھے بلکہ اس کی تفہیم و تبلیغ کے لئے میری زبان کو بھی

رواں کر دیا تھا، محض پیٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر یا جسم و جان کی صحت و خیریت کی خاطر میں نے اس راہ سے انحراف تو کجا اس کی ترجیحات (Priorities) میں کوئی ردّ و بدل بھی کیا تو میں یقیناً ؎ "میں ہوں اپنی شکست کی آواز!" ......اور ؎ "وہ بدنصیب جو گر جائے اپنی آنکھوں سے!" کا مصداق کامل بن کر رہ جاؤں گا۔ پھر اس معنوی خودکشی کے بعد محض حیوانی جبلتوں کی خاطر اور ایک جدید طبّی اصطلاح کے مطابق۔ 'Human Vegetable' کی صورت میں زندہ رہنا "چہ ضرور؟" گویا ؎ "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا!" [۱]

الغرض، یہ تھی وہ ادھیڑ بُن جس میں میں رمضان مبارک کے بعد شدّت کے ساتھ مبتلا ہو گیا تھا۔ کہ دل پہلی راہ کی جانب کھینچتا تھا اور توکّل و تفویض کی راہ دکھاتا تھا تو نفس دوسرے راستے کی طرف رہنمائی کرتا تھا اور ساتھ ہی یہ "رشوت" بھی پیش کرتا تھا کہ سعودی عرب کی ملازمت اختیار کر لو، تنخواہ بھی اچھی ملے گی، حج اور عمروں کی سہولت بھی میسّر رہے گی، اور حرمین کی نمازوں کے ذریعے اجر و ثواب کے انبار بھی جمع کئے جا سکیں گے، جن سے کسی نہ کسی حد تک دعوت و اقامتِ دین کی راہ سے پسپائی اختیار کرنے کی تلافی بھی ہو جائے گی۔ (واضح رہے کہ اس وقت تک سعودی عرب میں پاکستانی ڈاکٹروں کی مانگ بہت تھی!)

میں اسی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا، اور اس شش و پنج نے مجھے بالکل اس کیفیت سے دوچار کر دیا تھا جو حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے جو ایک حدیث میں وارد ہوئے ہیں، یعنی۔ "قد امرضتنی واسقمتنی واحزنتنی" [۲] کہ اچانک لندن سے برادر عزیز ابصار احمد کی زوردار دعوت موصول ہوئی کہ آپ کے پاس حج تک کافی

---

[۱] کسی غیر معروف شاعر کے یہ دو اشعار مجھے بے حد پسند ہیں: ؎

اِک تصوّر کے حسنِ معنی پر ساری ہستی لٹائی جاتی ہے
زندگی ترکِ آرزو کے بعد کیسے سانسوں میں ڈھالی جاتی ہے

[۲] "جس نے مجھے بیمار کر دیا ہے اور نڈھال کر دیا ہے اور غمزدہ کر دیا ہے"۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ کے یہ الفاظ ایک طویل حدیث میں وارد ہوئے ہیں جسے احمدؒ، بزارؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ، اور ترمذیؒ نے روایت کیا ہے اور امام ترمذیؒ نے اسے حدیثِ حسن قرار دیا ہے!

وقت ہے کیوں نہ ایک چکر انگلستان کا لگالیں؟..... میرے دل نے بھی صلاح دی کہ زندگی کا اہم ترین اور مشکل ترین فیصلہ مسلسل ایک ہی فضا میں رہتے ہوئے کرنے سے بہتر ہے کہ ایک مختلف بلکہ مخالف ماحول میں اپنی قوتِ ارادی اور ذہن و قلب کی استقامت و مقاومت کو آزمالیا جائے..... چنانچہ فوراً پروگرام بن گیا..... اور برادرم صہیب حسن کی معیت میں دوسرا عمرہ ادا کرتے ہوئے جدّہ آنا ہوا۔ اور وہاں بھی انہی کی رہنمائی میں لندن کے لئے ویزا کے حصول اور پھر سستے ٹکٹ کی تلاش کے مراحل طے ہوئے، اور اغلباً ۱۶ر دسمبر ۱۹۷۰ء کو میری لندن اور اُن کی نیروبی روانگی ہو گئی..... اور غالباً ۱۵ر دسمبر کی سہ پہر کو جدّہ ہی میں میرے اعصاب پر جو شدید دباؤ پچھلے دو ہفتوں کے دوران رہا تھا، اس کا ظہور اس طور سے ہوا کہ مجھے دفعتاً اپنے ذہن میں ایک مہیب خلا محسوس ہوا اور میری یادداشت بالکلیہ جواب دے گئی۔ چنانچہ بالکل ایسے لگتا تھا جیسے میری نگاہوں کے سامنے کی چیزوں کے سوا ہر شے اور ہر بات میرے ذہن سے اوجھل اور حافظے سے محو ہو گئی ہے۔ اس روز چند گھنٹے مجھ پر جس شدید الجھن میں گزرے اس کی یاد ہی سے مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے..... اور میں اللہ کی پناہ مانگنے لگتا ہوں۔ میری اس کیفیت پر برادرم صہیب حسن بھی سخت پریشان ہوئے تاہم وہ ہر طرح مجھے سکون پہنچانے کی کوشش کرتے رہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ رات کی آمد کے ساتھ ہی یہ کیفیت ختم ہو گئی اور میں گویا دوبارہ دنیا میں آ گیا۔ (جاری ہے)

اسلام میں داڑھی کا مقام

از قلم: حافظ خالد محمود خضر

تنظیم اسلامی ایک انقلابی جماعت ہے جو اللہ کی زمین پر اللہ کا حکم اور اس کا دین غالب و سربلند کرنے کا علم لے کر اٹھی ہے۔ رفقائے تنظیم کی زندگیوں کا مقصد اور نصب العین اس راہ میں اپنی تمام تر صلاحیتوں اور استعدادات کے ساتھ جدّوجہد اور کشاکش کے ذریعے رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اس انقلابی تنظیم کے رفقاء لفظ "انقلاب" کے معنی و مفہوم سے بھی بے خبر نہیں ہیں کہ اس لفظ کا اطلاق اگر ایک طرف اصطلاحاً کسی ملک یا معاشرے کے اجتماعی نظام میں کسی نوع کی اساسی نوعیت اور قابلِ لحاظ مقدار کی حامل تبدیلی پر ہوتا ہے تو دوسری طرف اس کے لفظی معنی بدل جانے اور لوٹ آنے کے بھی ہیں۔ چنانچہ "انقلاب اسلامی" کے علمبردار ایک طرف اعلائے کلمۃ اللہ اور غلبہ و اقامتِ دین کے لئے جہدو کوشش کرتے ہوئے اس راہ میں اپنی جانوں کے نذرانے دینے کے لئے تیار رہتے ہیں تو دوسری طرف خود اپنی زندگیوں میں بھی اسلامی تعلیمات کے مطابق انقلاب برپا کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ انہوں نے جس دین کو دینِ حق سمجھا ہے اور اس کے نظامِ عدل و قسط کے فیوض و برکات سے وہ پورے عالم کو مستفیض کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے قریبی حلقۂ اثر، اپنے گھر اور اپنی ذات کو اس کے انوار سے محروم نہیں رکھتے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو شخص اپنے گھر کی چار دیواری میں اسلام کا نظام نافذ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا اور اپنے پانچ چھ فٹ کے جسم پر حاکم حقیقی کا حکم جاری و ساری نہیں کر سکتا وہ اگر اس زعم میں مبتلا ہے کہ اس کی کوشش و کاوش سے معاشرے میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی آ سکتی ہے تو ؎

ایں خیال است و محال است و جنوں!

موجودہ دور میں "اقامتِ دین" کے لئے کام کرنے والی جماعتوں کے درمیان "تنظیم اسلامی" اگرچہ ایک چھوٹے سے قافلے کا نام ہے لیکن اس کے لئے یہ مابہ الامتیاز ہے کہ میر کارواں کی حقیقت شناس نگاہوں سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ راہ حق میں صرف انہی جانوں کا خون رنگ لاتا ہے جو تربیت و تزکیہ کی بھٹی سے گزر کر کندن بن چکی ہوں اور جن کے ظاہر و باطن میں "اسلامی انقلاب" کا عکس نظر آ رہا ہو..... چنانچہ "کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ" کے فرمانِ نبویؐ کی روشنی میں رفقائے تنظیم کو اپنی نجی زندگیوں اور اپنے اپنے دائرۂ مسئولیت میں اسلامی تعلیمات و احکامات کے مطابق تبدیلیاں لانے کی ہدایات دی جاتی ہیں..... اور اس نعمت پر قسّامِ قسمت کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے کہ اس گئے گزرے دور میں بھی رفقائے تنظیم کو دین کے ایسے احکام پر عمل پیرا ہونے کی توفیق نصیب ہوئی ہے جو معروف معنوں میں بڑے دیندار اور دین پسند طبقات کے ہاں بھی لائقِ اعتناء قرار نہیں پاتے۔ مثلاً شادی بیاہ کی غیر اسلامی رسومات سے اعلانِ برأت اور ستر و حجاب کے شرعی احکام پر عمل درآمد یقیناً ایسے اقدامات ہیں جن کا حوصلہ وقت کے بڑے بڑے خدامِ دین میں بھی (الا ماشاء اللہ) نہیں پایا جاتا۔ لیکن انہی اقدامات پر اکتفاء کرتے ہوئے تربیت کے مرحلے کی تکمیل کا کسی بھی درجے میں احساس ایک خطرناک غلطی ہوگی۔ بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ رفقائے تنظیم قرآن و سنت کے معیار کے مطابق حقیقی مسلم و مومن بننے کے لئے جہدو کوشش کرتے رہیں۔ اس ضمن میں ظاہر اور باطن دونوں کی اصلاح یکساں ضروری ہے۔ باطنی طور پر وہ ایمانِ حقیقی، تقویٰ، خدا ترسی اور اسلامی اخلاق کے پیکر ہوں تو ان کے ظاہر میں بھی اُس نقشے کا عکس موجود ہو جو نقشہ ہمیں حدیث و سیر کی کتابوں میں رسول اللہؐ اور صحابہ کرامؓ کی ظاہری وضع قطع اور چال ڈھال کے متعلق ملتا ہے۔ ظاہری وضع قطع کے ضمن میں ایک نہایت اہم چیز سنت نبویؐ کے مطابق چہرے کی تزئین ہے۔ پیشِ نظر تحریر میں دین میں داڑھی کی اہمیت واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی شرعی مقدار کی طرف بھی توجہ دلائی جائے گی تاکہ اس معاملے میں کوتاہی کرنے والے حضرات اپنے عمل کی اصلاح کی طرف مائل ہو سکیں۔

تقاضائے فطرت..... فطرتِ انسانی میں بھلے برے کی تمیز فاطرِ فطرت کی طرف سے ودیعت شدہ ہے اور ایک سلیم الفطرت اور سلیم الطبع انسان اپنے نورِ فطرت کی روشنی ہی میں ایسی

وضع قطع اختیار کر سکتا ہے جو احسن الخالقین کے منشاء کے مطابق ہو۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

عشر من الفطرۃ۔ قصّ الشارب' واعفاء اللحیہ' والسّواک' واستنشاق الماء' وقص الاظفار' وغسل البراجم' ونتف الابط' وحلق العانۃ'۔ وانتقاص الماء... الخ

ترجمہ۔ "دس چیزیں فطرت سے ہیں۔ مونچھیں کٹوانا' داڑھی بڑھانا' مسواک کرنا' ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنا' ناخن کاٹنا' انگلیوں کے جوڑوں کے اوپر کے حصے کو صاف رکھنا' بغل کے بال صاف کرنا' زیر ناف کے بال صاف کرنا' پانی سے استنجاء کرنا۔ اور راوی کا کہنا ہے کہ وہ دسویں چیز بھول گیا۔ (مسلم باب خصائل الفطرۃ)

اس حدیث کی تشریح میں محدثین کرام نے اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان فطری امور کو ترک کر دینے والا اشرف انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی کی صورت انسانوں جیسی ہی نہ رہی تو مسلمانوں جیسی کہاں رہے گی!

ابلیس لعین جب نافرمانی و سرکشی کے باعث بارگاہِ رب العزت سے دھتکارا گیا تو اس نے بنی آدم کو گمراہ کرنے کی قسم کھائی تھی اور کہا تھا: "وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ"۔ (ترجمہ) "اور میں ان کو حکم دوں گا جس سے یہ اللہ کی بنائی ہوئی صورت کو بگاڑا کریں گے"۔ اس آیت کی تفسیر میں مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ داڑھی منڈانا بھی اس صورت بگاڑنے میں شامل ہے۔ گویا آدمؑ کا ازلی دشمن شیطان مردود ابنِ آدم کو راہِ ہدایت سے بھٹکانے اور گمراہی کے گڑھوں میں دھکیلنے کے لئے جو ذرائع اور ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اسے خوبصورت بننے کا جھانسہ دے کر اسے اس کی فطری زینت سے محروم کر دیتا ہے۔

جملہ انبیاء کی سنت

انسانوں میں انبیائے کرامؑ (علیہم الصلوٰۃ والسلام) وہ ممتاز اور برگزیدہ ہستیاں ہیں جن کا نورِ فطرت درجۂ کمال کو پہنچا ہوتا ہے' اور اس کے ساتھ نورِ وحی کا اتصال نورٌ علیٰ نور کا مصداق کامل ہے...... یہی وجہ ہے کہ اکثر علماء نے مندرجہ بالا حدیث میں "فطرت" سے سننِ انبیاء مراد لی ہیں۔ یعنی مذکورہ دس چیزیں (جن میں سے اوّلین مونچھوں کا کٹوانا اور داڑھی کا

بڑھانا ہیں) جملہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سنتوں میں سے ہیں' جو بلاشک و شبہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے اور ہمیں ان کی اقتداء و پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ سورۃ الانعام کے رکوع نمبر ۱۰ میں اٹھارہ انبیائے کرام علیہم السلام کے اسمائے گرامی ذکر کر کے فرمایا گیا کہ انبیائے کرامؑ کی برگزیدہ جماعت ہی صراط مستقیم پر گامزن تھی اور اس کے ساتھ ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ (الانعام - ۹۰)

ترجمہ۔ "یہ (انبیاء) ہی ایسے حضرات تھے جنہیں اللہ نے ہدایت دی تھی' تو آپؐ بھی ان ہی کے طریقے پر چلئے!"

اتباع رسولؐ کا تقاضا

دنیا کا عام دستور ہے کہ لوگ جس شخصیت سے محبت کرتے ہیں یا کسی وجہ سے اس سے متاثر ہوتے ہیں اس کی وضع قطع اور چال ڈھال اختیار کرنے کو باعثِ فخر سمجھنے لگتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب آنجہانی ماؤزے تنگ کی "ماؤ کیپ" سوشلسٹ دنیا کے علاوہ ہمارے یہاں کے ماؤ نواز حلقوں میں بھی بہت زیادہ مقبول ہوئی تھی۔ اسی طرح بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح سے اظہارِ عقیدت کے طور پر ان کی ٹوپی اور شیروانی نے ہمارے لئے قومی لباس کا درجہ اختیار کر لیا۔ اس ضمن میں سکھ مذہب کے پیروکار اس انتہا پر پہنچے کہ اپنے گرو گوبند سنگھ کے اتباع میں انہوں نے خلافِ فطرت پابندیوں کو بھی قبول کیا اور ان کے ہاں سر اور داڑھی تو درکنار' جسم کے کسی بھی حصّے سے بال کاٹنا حرام قرار پایا۔ لیکن ایک ہم ہیں جو دین فطرت کے پیروکار ہوتے ہوئے اپنے اُس آقا و مولا اور محسن و مربی کی وضع قطع ترک کرنے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں جسؐ نے انسان کو حیوانیت کی سطح سے بلند کر کے تہذیب و تمدّن کا شعور بخشا۔ یہ ہمارا المیہ ہے کہ ہماری زبانیں اپنے نبی محترم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح و نعت کرتے اور ان سے عشق و محبت کا دم بھرتے نہیں تھکتیں' لیکن ہم آنحضورؐ کی پسند اور ناپسند کو اپنی پسند و ناپسند کا معیار نہیں بنا سکتے۔ ہم صدیوں تک ہندوؤں کے ساتھ رہتے رہتے ان کی معاشرت کے خوگر ہو گئے اور ہماری معاشرتی رسومات پر ہندوانہ تمدّن کی گہری چھاپ پڑ گئی۔ رہی سہی کسر انگریز کے دورِ غلامی نے نکال دی اور ہماری نگاہیں مغربی تہذیب کی چکاچوند سے اس طرح خیرہ ہوئیں کہ وہ قوم جو دنیا کو تہذیب و تمدّن اور آدابِ معاشرت سکھانے آئی تھی وہ

اغیار کی تہذیب اپنانے کو اپنے لئے باعثِ شرف سمجھنے لگ گئی' اور ہم نے یورپی لباس زیبِ تن کرنے اور ٹائی کا پھندا اپنی گردنوں میں ڈالنے پر ہی اکتفا نہیں کیا' بلکہ اپنے چہروں کو بھی سنتِ نبویؐ کے جمال سے محروم کر ڈالا۔

امتِ مسلمہ اگر محض رسم دنیا اور دستورِ زمانہ ہی کی رعایت کرتی تو بھی اپنے قائدِ حقیقیؐ کی ایک ایک سنّت اس قابل تھی کہ اسے حرزِ جاں بنایا جاتا' لیکن اس پر مستزاد یہ کہ خود خالقِ کائنات نے ہمیں آنحضورؐ کے اتّباع کا حکم فرمایا۔ قرآن حکیم میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بایں الفاظ خطاب فرمایا گیا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ

ترجمہ۔ " (اے نبی! اہل ایمان سے) کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتّباع کرو۔ نتیجۃً اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری لغزشوں سے در گزر فرمائے گا" ...... گویا اتباع رسولؐ کا راستہ محبوبیتِ الٰہی کا راستہ ہے۔ اللہ کے محبوبؐ کا اتباع کرنے والا خود اللہ کا محبوب بن سکتا ہے۔ اور اتباع کا تقاضا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نورانی سنتوں سے اپنی شخصیتوں کو منوّر کیا جائے۔

بعض نادان اس بنیاد پر داڑھی اور دیگر سنتوں کا التزام ضروری نہیں سمجھتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان عادات کا تعلق آپؐ کے اپنے شخصی مزاج' قومی طرزِ معاشرت اور اپنے عہد کے تمدّن سے تھا۔ لیکن ان کا یہ طرزِ استدلال قرآن وحدیث کی روشنی میں اس طرح غلط ہے کہ اولاً تو قرآن نے اتباعِ رسولؐ کا حکم دیا ہے اور اتباع کا دائرہ آپؐ کی تمام سنتوں کو محیط ہے' خواہ وہ ایسی عظیم سنت ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد ہی اس کا قیام و نفاذ ہو' اور خواہ وہ اس کی نسبت سے وہ چھوٹی چھوٹی سنتیں ہوں جن کا تعلق آپؐ کی روزمرہ زندگی کے معمولات سے ہو۔ اور ثانیاً اس بات کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ایسی تمام سنتیں جنہیں حضورؐ نے کبھی ترک نہ فرمایا ہو اور امت کو انہیں اختیار کرنے کا حکم بھی فرما دیا ہو' ان کا تعلق حضورؐ کے اپنے معاشرے کے رسم ورواج اور آپؐ کے عہد کے تمدن تک محدود نہیں رہتا بلکہ یہ دین میں سننِ مؤکدہ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں' جن پر عمل ہر امتی کے لئے لازمی و ضروری ہوتا ہے اور جن کا ترک کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کے زمرے میں آتا ہے..... معلوم نہیں کہ اس قسم کے مغالطے پیدا کرنے والے حضرات کو قرآن کریم کے صفحات میں یہ آیۂ مبارکہ کیوں نظر نہیں آتی:

مَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوا

یعنی رسول تمہیں جس بات کا حکم دیں اس پر کاربند ہو جاؤ اور جس چیز سے روکیں اس سے مجتنب ہو جاؤ۔

داڑھی کا وجوب فرمانِ نبویؐ سے

داڑھی کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں مندرجہ بالا نکات یعنی اس کا تقاضائے فطرت ہونا، جملہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا بالا جماع اس کو اختیار کرنا اور خصوصاً نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سنتِ مبارکہ پر ہمیشہ عمل پیرا رہنا ایسے نکات ہیں جن سے داڑھی رکھنے کے وجوب پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ گویا اگر بالفرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم داڑھی رکھنے کا صراحتہً حکم نہ دیتے تو بھی امت کے لئے اس پر عمل لازم تھا۔ لیکن اس بارے میں ایک دو نہیں، متعدد احادیث نبویؐ ملتی ہیں جن میں آنحضورؐ نے صراحت کے ساتھ اور بڑے تاکیدی انداز میں صرف داڑھی رکھنے ہی کا نہیں، داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے، لہٰذا شرعاً اس کے واجب ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ اس سلسلے کی احادیث بخاریؒ، مسلمؒ، مالکؒ، ترمذیؒ، ابو داؤدؒ، نسائیؒ اور دیگر ائمہ حدیث نے روایت کی ہیں۔ رحمھم اللہ علیہم اجمعین!

(۱) عن ابن عمر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم:
انھکوا الشوارب وأعفوا اللحی (بخاری)

(۲) أحفوا الشوارب وأعفوا اللحی
(مسلم، ترمذی، موطا امام مالک، ابو داؤد، نسائی)

دونوں احادیث کا مفہوم ایک ہی ہے۔ یعنی مونچھوں کو خوب کم کرو، اور داڑھیوں کو خوب بڑھنے دو!

(۳) "خالفوا المشرکین وفروا اللحی وأحفوا الشوارب" (بخاری)

وفی روایۃ۔ اوفروا اللحی وأحفوا الشوراب (مشکوٰۃ۔ قدیمی کتب خانہ)

(۴) خالفوا المشرکین أحفوا الشوارب وأوفوا اللحی" (مسلم)

ان دونوں احادیث کے معنی یہ ہوئے کہ مشرکین کی مخالفت کرو، مونچھوں کو خوب باریک کرو

اور داڑھیوں کو خوب بڑھاؤ!

(۵) عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم- جزو الشوارب' وأوفوا اللحی' خالفو المجوس (مسلم بحوالہ جامع الاصول)

وفی روایة: وأرخوا اللحی بالخاء المعجمة

وفی روایة اخری- وأرجوا اللحی بالجیم واصله ارجئوا

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مونچھوں کو کترنے میں مبالغہ کرو' اور داڑھیوں کو خوب زیادہ کرو' مجوسیوں کی مخالفت اختیار کرو!)

مندرجہ بالا احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے داڑھیاں بڑھانے کے لئے امر صریح کے چھ صیغے نقل ہوئے ہیں۔ اُعفوا' اُوفوا' اُرخوا' اُرجوا' وفروا اور اُوفروا..... اور ان چھ میں سے کسی ایک کے معنی بھی محض داڑھی رکھنے کے نہیں ہیں بلکہ داڑھی بڑھانے' بڑھنے دینے' خوب زیادہ کرنے اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دینے کے ہیں۔ اور اصول یہ ہے کہ "الامر للوجوب" یعنی امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ اور خارجی قرائن کے بغیر اس سے اباحت یا استحباب مراد نہیں لیا جاسکتا۔ چنانچہ اس ضمن میں اتنی تاکید اور مختلف انداز سے امر کی اس قدر تکرار فقہاء کے نزدیک اس مسئلے کے واجب شرعی ہونے کی واضح دلیل ہے اور اس سے گریز و انحراف کسی صورت میں بھی جائز نہیں ہے۔ اتنی تصریح کے باوجود بھی اگر کسی نے اپنے ذہن میں اس خیال خام کو جگہ دے رکھی ہو کہ ممکن ہے یہاں امر محض اخلاقی حکم کے طور پر آیا ہو تو اس کے اس شبہ کا ازالہ مندرجہ ذیل حدیث سے ہو جانا چاہئے۔

عن عبدالله ابن عمر عن النبی صلی الله علیه وسلم انه امر بأصفاء الشوارب واعفاء اللحی- وفی روایة إعفاء اللحیة - (مسلم' موطا' ترمذی)

ترجمہ۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے مونچھیں پست کرنے اور داڑھیاں بڑھانے کا حکم دیا ہے۔

یہ احادیث اُن حضرات کے پیدا کردہ مغالطے دور کرنے کے لئے بھی کفایت کرتی ہیں

جن کا دعویٰ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کے متعلق صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض داڑھی رکھنے کا نہیں بلکہ بتکرار و اعادہ داڑھی بڑھانے کا حکم فرمایا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ چھوٹی چھوٹی، خشخشی، فرنچ کٹ اور بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم "مولوی دیدار علی کی داڑھی" کی قسم کی داڑھیاں شارع علیہ السلام کا مطلب پورا نہیں کرتیں۔

داڑھی منڈانے میں کفار سے مشابہت

مندرجہ بالا احادیث میں خالفوا المشرکین اور خالفوا المجوس کے الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ داڑھی منڈانا اور پست کرانا مشرکین اور مجوسیوں کا شیوہ تھا، لہٰذا ان کی مخالفت میں داڑھیاں خوب بڑھانے کا حکم دیا گیا۔ کفار کی مشابہت اختیار کرنے سے بچنا اور ان کی وضع قطع اور طور طریقوں کی مخالفت دین کی مستقل تعلیم ہے۔ چنانچہ حدیثِ نبویؐ ہے:

من تشبہ بقوم فھو منھم (احمد، ابو داؤد)

ترجمہ۔ "جس نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی تو (انجام کار) وہ انہی میں سے ہو گا"۔

دنیا میں کسی بھی قوم اور مذہب کا مستقل وجود اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے اور باقی رہ سکتا ہے جبکہ وہ وضع قطع اور تہذیب و ثقافت میں اپنی امتیازی خصوصیات برقرار رکھے۔ چنانچہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ملتِ اسلامیہ ان نظریاتی اور عملی امتیازات کا دل و جان سے تحفظ کرے جو دینِ اسلام کو دیگر مذاہب سے ممتاز کرتے ہیں، اور جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے فرمانبرداروں کی اس کے باغیوں اور سرکشوں سے تمیز کی جا سکتی ہے۔ انہی امتیازات کو شعائرِ اسلام کہا جاتا ہے اور ان میں داڑھی بھی اسلام کا ایک اہم شعار ہے۔

داڑھی منڈانے میں عورتوں سے مشابہت

داڑھی نہ رکھنے میں جہاں اللہ اور اس کے رسولؐ کی صریح نافرمانی کے علاوہ کفّار سے مشابہت کے گناہ کا پہلو بھی ہے، وہاں اس عملِ قبیح میں گناہ کا ایک مزید پہلو عورتوں سے مشابہت کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مردوں اور عورتوں کو علیحدہ علیحدہ جسمانی ہیئت عطا فرمائی ہے اور اسے سخت ناپسند کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مشابہت اختیار کریں۔ قاری محمد طیب صاحب "داڑھی کی شرعی حیثیت" میں تحریر فرماتے ہیں:

"اگر وہ تشبّہ (یعنی تشبّہ بالکفار) اس وجہ سے گناہ تھا کہ اس سے دو گروہوں کا خصوصیاتی فرق مٹ کر حدودِ الٰہی کی تخریب ہو جاتی تھی تو یہ تشبہ (یعنی تشبہ بالنساء) بھی اسی لئے گناہ ہو گا کہ اس سے دو صنفوں کا خصوصیاتی فرق مٹ کر حدودِ خداوندی کی تخریب ہوتی ہے۔ اس لئے شریعت نے اس تشبہ کو بھی خواہ مرد عورت سے کرے یا عورت مرد سے 'لعنت قرار دیا ہے کہ یہ خدا کی بنائی ہوئی حدود کو مٹانا ہے" ..... چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کرتے ہیں:

لعن الله المتشبهين من الرجال بالنساء و المتشبهات من النساء بالرجال

ترجمہ۔ "اللہ نے لعنت بھیجی ہے عورتوں سے مشابہت اختیار کرنے والے مردوں پر اور مردوں سے مشابہت اختیار کرنے والی عورتوں پر"۔

داڑھی منڈانا مُثلہ ہے

کسی کے ناک کان وغیرہ کاٹ کر شکل بگاڑ دینے کو مثلہ کہا جاتا ہے' جو شریعت میں حرام ہے' خواہ یہ سلوک کسی دوسرے فردِ نوعِ بشر کے ساتھ کیا جائے یا خود اپنی شکل وصورت کے ساتھ۔ قاضی محمد شمس الدین صاحب نے اپنی تصنیف "داڑھی کی اسلامی حیثیت" میں طبرانی کے حوالے سے حضرت ابن عباسؓ کی یہ روایت نقل کی ہے۔

قال النبی صلی الله علیه وسلم- من مثل بالشعرفلیس له عندالله من خلاق

ترجمہ۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کسی نے (داڑھی کے) بالوں کا مُثلہ کیا اس کا اللہ کی رحمت میں کوئی حصہ نہیں"۔

کتاب مذکور میں مختلف حوالوں سے وضاحت کی گئی ہے کہ اس حدیث کی تشریح میں شارحین حدیث نے بالوں کے مثلہ سے داڑھی کے بالوں کا مونڈنا یا دور کرنا ہی مراد لیا ہے۔ اور فتاویٰ نجدیہ میں اس حدیث کو داڑھی منڈانے کے حرام ہونے میں بطور استدلال پیش کیا گیا ہے۔

صحابہ کرامؓ بھی داڑھی کے دور کرنے کو مُثلہ ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ جنگ جمل کے موقع پر جب بصرہ کے گورنر حضرت عثمان بن حنیف کی داڑھی نوچ ڈالی گئی تو اسے مُثلہ ہی کہا گیا۔

فقہاء نے بھی داڑھی کے نوچنے یا مونڈنے کو ناک یا کان کاٹنے کی طرح مثلہ ہی قرار دیا

ہے اور اسے قابل تاوان جرم ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی کسی شخص کی داڑھی زبردستی مونڈ ڈالے تو مونڈنے والے پر ناک کان کی دیت کے برابر دیت لازم ہوگی' کیونکہ اس نے ایک شخص کا جمال ضائع کر دیا۔ (ملاحظہ ہو ہدایہ کتاب الدیات) پس ثابت ہوا کہ داڑھی منڈانے والے حضرات خود اپنا مثلہ کرتے ہیں اور اللہ کی بنائی ہوئی شکل وصورت کو بگاڑتے ہیں اور ایسے لوگ حدیث نبویؐ کی رو سے اللہ کی رحمت سے محروم ہیں۔

واضح رہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک مونچھوں کا استرے سے مونڈنا بھی مثلہ ہے' کیونکہ احادیث میں مونچھیں کترانے' خوب باریک کرنے اور کاٹنے میں مبالغہ کرنے کا حکم ہے' کہیں بھی سرے سے مونڈ ڈالنے کا حکم نہیں ہے۔

داڑھی منڈانا قوم لوطؑ کا عمل

علامہ آلوسیؒ نے "روح المعانی" میں ابن عساکر وغیرہ کے حوالے سے حضرت حسن سے مرسلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے کہ قوم لوطؑ میں دس خصلتیں تھیں' جن کی وجہ سے وہ ہلاک کی گئی۔ ان دس میں علاوہ دیگر بد خصلتوں کے' داڑھیاں منڈانا اور مونچھیں بڑھانا بھی روایت کیا ہے۔

داڑھی منڈانے والوں سے حضورؐ کا اظہار ناپسندیدگی

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی نے اپنے رسالہ "داڑھی کا وجوب" میں اور قاضی شمس الدین صاحب نے "داڑھی کی اسلامی حیثیت" میں مستند تاریخی حوالوں سے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ کسریٰ شاہ ایران کے پاس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکتوب مبارک پہنچا تو اس نے غصے میں آکر اس کو چاک کر دیا اور یمن میں اپنے گورنر بازان کو حکم بھیجا کہ اس شخص (محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیجا جائے۔ چنانچہ بازان نے اس مقصد کے لئے ایک فوجی دستہ مامور کیا۔ اس دستے کے دو افسر بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے تو رعبِ نبوت کی وجہ سے ان کی رگہائے گردن تھر تھرا رہی تھیں۔ مجوسیوں کے دستور اور فیشن کے مطابق ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی اور مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی یہ مکروہ شکل بہت ناگوار گزری اور آپؐ نے اپنا رخِ انور

ان سے پھیر لیا۔ اور فرمایا تم پر ہلاکت ہو' کس نے تمہیں ایسا حلیہ بنانے کا حکم دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے رب (کسریٰ) نے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیکن میرے رب نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم دیا ہے۔

ہمارے لئے غور و فکر کا مقام ہے کہ جب غیر مسلم سفیروں کی اس خلاف فطرت شکل و صورت سے آنحضورؐ کو اتنی تکلیف پہنچی کہ آپؐ نے ان سے منہ پھیر لیا' تو قیامت کے روز اپنے امتیوں کی ایسی ہی مکروہ صورتوں سے آپؐ کو کتنی تکلیف ہوگی۔ اور اگر وہ ذاتِ اقدس ہی ناگواری اور بیزاری سے منہ پھیر لے جس کی شفاعت پر ہماری امیدیں وابستہ ہیں تو یہ کتنا بڑا خسارہ اور کس قدر محرومی ہوگی!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی کیفیت

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کی کیفیت اور مقدار کی مندرجہ ذیل احادیث سے بخوبی وضاحت ہو جاتی ہے:

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرماتے تو پانی کی ایک لپ لے کر اپنی ٹھوڑی کے نیچے داخل کرتے۔ پس اس سے اپنی داڑھی کا خلال فرماتے اور کہتے کہ اسی طرح میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے۔

(ابو داؤد..... بحوالہ مشکوٰۃ)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی کا خلال فرمایا کرتے تھے۔ (ترمذی و دارمی..... بحوالہ مشکوٰۃ)

خلال کے اصطلاحی معنی وضو کے دوران ہاتھوں کی انگلیوں کو داڑھی کے بالوں میں اندر کی جانب سے داخل کر کے باہر کو نکالنا ہیں۔ مذکورہ احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک دراز تھی' ورنہ چھوٹی داڑھی میں خلال کی کیا ضرورت ہے۔ وہاں تو پانی خود بخود جلد تک پہنچ جاتا ہے۔

اب چھوٹی چھوٹی اور خشخشی داڑھیوں والے حضرات کے لئے لمحۂ فکریہ ہے کہ نہ صرف اُن کی داڑھیاں سنتِ نبویؐ کے مطابق نہیں ہیں' بلکہ وہ وضو میں داڑھی کا خلال کرنے کی سنّت سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کی کیفیت اس طرح بیان کی گئی ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کث اللحیۃ تملاء صدرہ (ترمذی۔ بحوالہ داڑھی کی اسلامی حیثیت)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھنی داڑھی رکھتے تھے جو آپؐ کے سینہ مبارک کو بھر دیتی تھی"۔

حضرت عبداللہ بن سخبرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں جسے بخاری اور ابو داؤد نے روایت کیا ہے حضورؐ کی ریش مبارک کے گھنا اور دراز ہونے کی یہ کیفیت ملتی ہے کہ آپؐ کے پیچھے کھڑے ہوئے صحابہ کرامؓ سری نمازوں میں آپؐ کی داڑھی کی حرکت دیکھ کر سمجھ لیا کرتے تھے کہ آپؐ قرات فرما رہے ہیں۔

اسی طرح کئی اور احادیث سے بھی آپ کی ریش مبارک کا خوب گھنا اور دراز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمان رسولؐ کی تعمیل اور اتباع رسولؐ کا تقاضا یہی ہے کہ اپنی من پسند چھوٹی چھوٹی داڑھیوں کے جواز کے دلائل ڈھونڈنے کے بجائے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو اختیار کر لیا جائے۔

داڑھی کی شرعی مقدار

اب رہا یہ سوال کہ شرعی طور پر داڑھی کی کوئی حد بندی بھی ہے یا نہیں تو جان لینا چاہئے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مطلقاً داڑھیاں بڑھانے کا حکم دیا ہے اور اس کے لئے کوئی مقدار مقرر نہیں فرمائی کہ اس حد تک پہنچنے پر داڑھی کا بڑھانا بند کر دیا جائے۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عمل سے ہمیں داڑھی کو معتدل رکھنے کے لئے اسے تراشنے کی حد ضرور مل جاتی ہے، یعنی داڑھی کے بال اصلاح طلب ہوں تو ان کی تراش خراش کی جائے، لیکن مقررہ حد سے زیادہ نہ تراشی جائے۔ تو آیئے اس مقررہ حد کی تعیین کے لئے احادیث کی طرف رجوع کریں۔ عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان یاخذ من لحیتہ من عرضھا وطولھا (رواہ الترمذی) "حضرت عمرو بن شعیب اپنے باپ کے واسطے سے اپنے دادا سے روایت

کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی داڑھی میں سے (یعنی) اس کے طول و عرض میں سے کچھ حصہ تراش دیا کرتے تھے"۔

یہ تراشنا کس حد تک ہوتا تھا؟ احادیث مبارکہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی مبارک (اس تراشنے کے باوجود) کم از کم ایک مشت بلکہ اس سے زیادہ ثابت ہوتی ہے جس میں آپؐ خلال فرماتے، کنگھی سے اس کو درست فرماتے اور اس کے گنجان اور دراز ہونے کا یہ عالم تھا کہ اس نے سینۂ مبارک کے اوپر کے حصے کے طول و عرض کو بھر رکھا تھا۔

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کا بچشم سر مشاہدہ کرنے والے تھے۔ آپؐ کے یہ جاں نثار ساتھی آپؐ کے اقوال کو اپنے سینوں میں اور آپؐ کے افعال کو اپنی زندگیوں میں محفوظ کر لیتے تھے، لہٰذا ان سے بڑھ کر آپؐ کی سنتوں کا شیدائی اور آپؐ کی وضع قطع کا اتباع کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ صحابہ کرام میں سے جو حضرات اپنی داڑھیاں تراشتے تھے وہ ایک قبضہ (مشت) سے زائد ہو جانے کی صورت میں تراشتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ ان حضرات کا یہ عمل اتباع سنت ہی کا مظہر تھا چنانچہ یہ ہمارے لئے معیارِ عمل ہے۔ صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق حضرت عبداللہ بن عمر (رضی اللہ عنہما) جب حج یا عمرہ سے فارغ ہو کر حجامت بنواتے تو داڑھی کو مٹھی میں لے کر ایک مشت سے زائد کو تراش دیتے تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عمر اور حضرت ابو ہریرہ (رضی اللہ عنہما) بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔ عینی شرح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کی بے ڈھب داڑھی کی اصلاح کے لئے قینچی منگوائی۔ پھر اس کی داڑھی کو مٹھی میں لیا اور ایک شخص کو حکم دیا، جس نے آپؐ کے ہاتھ کے نیچے نکلتے ہوئے بالوں کو کاٹ دیا۔ (بحوالہ "داڑھی کے متعلق شرعی فیصلہ")

ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ داڑھی کی اصلاح اور موزونیت کے لئے اسے طول و عرض میں تراشنا پسندیدہ ہے، لیکن یہ تراشنا ایک مشت سے زائد مقدار میں درست ہو گا، اس سے کم میں نہیں! چنانچہ اس مسئلے پر تمام فقہائے امت کا اتفاق ہے کہ داڑھی کا ایک مشت سے کم کرنا جائز نہیں اور اس کا سرے سے صفایا کر دینا سب کے نزدیک حرام ہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ چونکہ خود شارع علیہ السلام نے داڑھی کی کوئی حد مقرر نہیں

فرمائی' اس لئے مختلف روایات سے فقہاء و محدثین نے ایک مشت کی جو حد مقرر کی ہے یہ بہر حال ان کا استنباط ہے اور کوئی مستنبط حکم وہ حیثیت حاصل نہیں کر سکتا جو ایک منصوص حکم کی ہوتی ہے۔ ان حضرات کی یہ بات اگرچہ اصولی طور پر درست ہے لیکن اس سے ان کا یہ نتیجہ نکال لانا کہ داڑھی کے چھوٹا یا بڑا ہونے سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا' کسی طور سے بھی درست معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ حکم مستنبط ایک مشت تک داڑھی بڑھانے کو لازم قرار نہیں دیتا بلکہ حکم منصوص جو مطلق تھا (یعنی مطلقاً داڑھیاں بڑھانے کا) یہ اس کو مقیّد کرتا ہے اور اس کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ اور ایک مشت سے زائد کو تراشنے کی گنجائش نکالتا ہے۔ چنانچہ جو حضرات تعامل صحابہ اور تعامل امت کے باوجود داڑھی کی ایک مشت مقدار کے قائل نہیں ہیں' منطقی طور پر ان کے لئے مناسب تر طرز عمل ہو گا کہ وہ احادیث کے ظاہری الفاظ پر عمل کرتے ہوئے داڑھیوں کو علیٰ حالہا بڑھنے دیں اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کریں!

اسلام میں داڑھی کے مقام اور اس کی حیثیت و اہمیت پر علمائے کرام کی بہت سی تصانیف موجود ہیں۔ موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ یہ مختصر سا مضمون علماء کی تحریروں سے استفادہ کر کے ان کی روشنی میں تحریر کیا گیا ہے' اور اس کی اشاعت سے تنظیم اسلامی کے رفقاء اور دیگر احباب کی رہنمائی مقصود ہے۔ امید ہے کہ جو حضرات اس ضمن میں تساہل اور کوتاہی کا شکار ہیں وہ اس سنتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی اہمیت سے آگاہی حاصل کر کے اپنے عمل کی اصلاح کر سکیں گے! وفقنا الله لما یحب و یرضی

اس مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

۱۔ صحیح بخاری
۲۔ صحیح مسلم
۳۔ جامع الترمذی
۴۔ الموطا للامام مالک
۵۔ مشکوٰۃ المصابیح
۶۔ منہج انقلاب نبوی' ڈاکٹر اسرار احمد
۷۔ رسالہ داڑھی کا فلسفہ' سید حسین احمد مدنی
۸۔ داڑھی کی شرعی حیثیت' قاری محمد طیب صاحب
۹۔ داڑھی کا وجوب' مولانا محمد زکریا کاندھلوی
۱۰۔ داڑھی کی اسلامی حیثیت' قاضی شمس الدین
۱۱۔ رسائل و مسائل (حصہ اول) 'سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم

تحریکِ نور بدیع الزمان سعید نورسی

تحریک اسلامی کے تسلسل کی پیش گوئی متعدد احادیث میں وارد ہوئی ہے۔

(۱) عن عائذبن عمرو المزنی رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وآله وسلم انه قال الاسلام یعلوا ولا یعلی علیه (اخرجه الدارقطنی)
ترجمہ..... اسلام غالب آکر رہے گا یہ مغلوب نہیں ہوگا۔

(۲) ان الله عزوجل یبعث لهذه الامة علی راس کل مائة سنة من یجدد لها دینها (اخرجه ابوداؤد۔ حاکم۔ طبرانی)
ترجمہ..... بے شک اللہ تعالیٰ اس امت کے لئے ہر صدی کے سرے پر مقرر کرتا رہے گا جو (افراد یا جماعتیں) اس کے لئے اس کا دین تازہ کرتے رہیں گے۔

(۳) عن جابر بن عبدالله قال قال النبی علیه الصلوة والتسلیمات لاتزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة (رواہ مسلم)
ترجمہ..... میری امت کبھی ایک ایسے گروہ سے خالی نہیں ہوگی جو حق پر لڑتا نہ رہے۔ یہ غالب رہیں گے قیامت کے دن تک۔

(۴) لن یبرح هذالدین قائما یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعته (اخرج سلم عن جابر بن سمرة رضی اللہ عنہ)
ترجمہ..... قیامت تک ایک جماعت مسلمانوں کی اس دین کو قائم رکھنے کے لئے لڑتی رہے گی۔

(۵) عن انس رضی الله عنه عن النبی صلی الله علیه وسلم (قال

ثلاث من اصل الایمان الکف عمن قال لااله الاالله ولانکفره بزنب ولانخرجه من الاسلام بعمل والجهاد ماض منذبعثنی الله الی ان یقاتل آخر هذه الاته الدجال لایبطله عدل عادل ولاجور جائر والایمان بالاقدار (رواہ ابوداؤد)

ترجمہ..... "تین چیزیں ایمان کی جڑ سے پیدا ہوتی ہیں (یا ایمان کی جڑ کا حصہ ہیں) ایک یہ کہ لا الہ الا اللہ کہہ دینے والے سے ہاتھ روک لینا اور یہ کہ ہم تکفیر نہیں کرتے کسی کی گناہ کے سبب اور یہ کہ ہم کسی کو عمل کے سبب سے اسلام سے خارج نہیں کرتے اور یہ کہ جہاد باقی رہے گا میری بعثت سے اس امت کے اس آخری حصہ تک جو دجال سے قتال کرے گا اسے عادل کا عدل ظالم کا ظلم اور تقدیر پر ایمان مٹا نہ سکے گا"۔

یہ اور ایسی ہی دیگر بے شمار احادیث جنہیں ہم نے طوالت کے خوف سے نقل کرنے سے گریز کیا ہے' پانچ باتوں کی شہادت دیتی ہیں ایک تو یہ کہ اسلام اپنی اصلی اور کامل شکل میں باقی رہے گا دوسرے یہ کہ بہر حال غلبہ و فتح اسلام کے مقدر میں ہے۔ تیسرے یہ کہ اہل حق کی جماعت علمی و فکری اور عملی و حکومتی سطح پر اسے قائم رکھنے کے لئے برسرپیکار رہے گی وہ لوگ جو بلا قتال کئے اسلام کے غلبہ پر یقین رکھتے ہیں انہیں اپنے مرض کا علاج لسان نبوی کے ان شفابخش الفاظ میں تلاش کرنا چاہئے۔ یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة گویا یہ غلبہ و اظہار مشروط ہے قتال علی الحق سے اسی لئے عصابۃ المسلمین کے قتال سے دین قائم ہوتا ہے یا رہتا ہے۔ چوتھے یہ کہ جہاد ہر حال میں فرض رہے گا خواہ وہ موافق حالات ہوں یا نا موافق اور پانچویں اور آخری بات یہ ہے کہ اہل حق کی جماعت کی پہچان یہ ہے کہ وہ جہاد و قتال اور غلبہ و اظہار دین حق سے وابستہ ہوتی ہے یعنی اس کی پوری زندگی دین کی سرفرازی کے لئے وقف ہوتی ہے۔ یہ احادیث اپنے اندر نہایت تشریح طلب مطالب اور اپنے دعاوی کی پشت پر نہایت قوی تاریخی شہادتیں رکھتی ہیں تاہم طوالت کے خوف سے ان چند موٹے موٹے مطالب کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں اور ان تاریخی شہادتوں میں سے دور جدید کی پانچ شہادتیں یکے بعد دیگرے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس سلسلہ میں ترکی' بلاد عرب' برصغیر' افغانستان اور مشرق بعید میں احیائے اسلام کے لئے ہونے والی بعض اہم تحریکیں پیش نظر ہیں۔

ثانیٔ مجدّد الف ثانی اور تحریک نور بدیع الزمان سعید نورسی

حالاتِ زندگی علامہ بدیع الزمان سعید نورسی کا اصل نام سعید اور نورسی گاؤں کی نسبت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بھی عجیب ہیں۔ چودھویں صدی ہجری میں جس شخصیت کو انہوں نے قرآن وایمان کا نور پھیلانے پر سب سے بڑھ کر مامور کیا اسے نور کی اتنی نسبتوں سے نوازا کہ انسان حیران ہو کر کہتا ہے کہ یہ اتفاق نہیں ہے چنانچہ آپ کی والدہ صاحبہ کا اسم شریف نور گاؤں کا نام نورس قادری سلسلہ کے شیخ کا نام نورالدین نقشبندی سلسلہ کے شیخ کا نام نور محمد اور قرآن کے استاد کا نام حافظ نوری تھا۔ آپ کے مشہور عالم رسائل 'رسائل نور اور تحریک تحریک نور کہلاتی ہے۔

آپ ترکی کے صوبہ بتلیس کے ضلع ہیزان میں ۱۸۷۳ء مطابق ۱۲۹۰ھ میں ایک کرد گھرانہ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے باپ کا نام مرزا تھا۔ مجھے بہن بھائیوں کی صحیح تعداد کا علم تو نہیں ہوسکا تاہم آپ پر لکھی گئی کتب میں ملا عبداللہ بڑے بھائی اور عبدالمجید نامی چھوٹے بھائی کا تذکرہ بصراحت ملتا ہے۔

بچپن ہی سے آپ میں حدت مزاج 'ذہانت' عزت نفس اور عبقریت کی صفات نمایاں تھیں۔ آپ میں حق گوئی اور دین کی حمیت کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے جابر سلطانی اور اتاترکی امرا خوفزدہ ہو جاتے تھے۔ بچپن میں آپ پڑھائی کی طرف رغبت نہیں رکھتے تھے تاہم ایک خواب میں قیامت کا منظر دیکھ کر آپ نے تعلیم کی طرف ذوق و شوق سے رجوع کیا۔ حافظہ و ذہانت کا یہ عالم تھا کہ مدارس میں رائج تمام کتب نہ صرف سمجھ کر پڑھ لیں بلکہ ازبر بھی کر لیں۔ تھوڑے عرصہ میں ایسا ہو جانا کیونکہ ناممکن تھا لہٰذا علماء سِعُرَدُ نے اکٹھا ہو کر ایک دن ان کا امتحان لیا اور آپ سے ایسے سوالات ہر موضوع سے متعلق پوچھنے شروع کر دیئے جن کا جواب دینا بڑے بڑے اساتذہ کے لئے مشکل تھا مگر سعید نورسی علیہ الرحمتہ ہر سوال کا تسلی بخش جواب دیتے چلے گئے جس پر علماء نے انہیں بدیع الزمان کے خطاب سے نوازا۔ اس وقت آپ کی عمر چودہ سال تھی۔

اس کے بعد استاد بدیع الزمان زہد و تقشف اور عبادت و ریاضت میں مصروف ہو گئے۔ تاہم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کبھی غفلت نہیں برتی۔ اس سلسلہ میں ان کے بے شمار واقعات نقل کئے گئے ہیں۔ جن میں آپ نے اپنی جان کو جوکھوں میں ڈال کر اعلائے کلمۃ

الحق کا فریضہ سرانجام دیا۔ ماردین میں یہ فریضہ سرانجام دینے کی پاداش میں آپ کو اپنی زندگی کی پہلی جلاوطنی سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ بتلیس چلے آئے اور رشد وہدایت کا سلسلہ جاری کیا۔ تاہم زیادہ عرصہ آپ نے یہاں قیام نہ کیا اور وان تشریف لے گئے۔ یہاں آپ نے پندرہ سال قیام کیا اور اپنے دینی فرائض کو نہایت جانفشانی سے ادا کیا۔ وان میں استاد سعید نے جدید علوم میں مہارت بہم پہنچائی اور جدید دنیا کے تغیرات کا گہرا مطالعہ کیا۔ اب استاد اس نتیجہ پر پہنچے کہ دینی مدارس میں از کار رفتہ علوم کو خارج کر کے جدید علوم داخل کئے جانے چاہئیں تاکہ علماء جدید دور کے فتنوں کا احسن طریق سے مقابلہ کر سکیں۔ اس خیال کے تحت استاد نے ایک یونیورسٹی کا منصوبہ تیار کیا اور امداد حاصل کرنے کے لئے سلطان کے دربار میں حاضر ہونے استنبول پہنچے۔

آپ کے استنبول پہنچنے سے پہلے ہی آپ کی عقل ودانش کا شہرہ وہاں پہنچ چکا تھا۔ چنانچہ استنبول کے قدیم وجدید علماء نے آپ سے سوالات کئے اور خود کو بے بس پایا۔ یہ عجیب بات ہے کہ سعید نورسی کسی عالم سے خود کوئی سوال نہیں کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ مجھے علماء کے علم پر اعتماد ہے البتہ انہیں اگر میرے بارے میں شک ہے تو وہ اپنا اطمینان کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بات بھی عجیب لگتی ہے کہ جس نے بھی ان سے بحث ومناظرہ کیا خود کو ہمیشہ ان سے علم میں فروتر پایا۔ استاد عالم اسلام کی ان چند گنی چنی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جن کی شخصیت ہر اعتبار سے مسلمہ بلند اور غیر متنازعہ رہی ہے۔

استاد بدیع الزمان سعید نورسی نوراللہ مرقدہ کی انقلاب انگیز زندگی کا آغاز ۱۹۰۹ء سے ہوتا ہے جب پانچ اپریل کو عید میلاد النبی کے دن آپ نے اتحاد محمدی کی بنیاد ڈالی۔ یہ جماعت ترکی میں آزاد دور مشروطیت کو مشروع دور مشروطیت تک لانا چاہتی تھی۔ مختصر عرصہ کے دوران اس کے ارکان پچاس ہزار سے متجاوز ہو گئے۔ استاد سعید اس جماعت کو منظم اور تربیت یافتہ انقلابی جماعت بنانا چاہتے تھے مگر مدرسی علماء کی اکثریت نے ناعاقبت اندیشانہ انداز میں عوام کو اکسا دیا اور انہیں اور ترکی فوج کے بعض دستوں کو لے کر پارلیمنٹ پر دھاوا بول دیا۔ گو بدیع الزمان رحمت اللہ علیہ نے اس بغاوت کو فرو کرنے کی بہت کوشش کی تاہم دارالحکومت پر باغی فوجوں نے قبضہ کر لیا جسے سالونیکا سے آکر محمود پاشا نے فوجی جنگ کے ذریعہ ختم کیا۔ ۲۷ر اپریل ۱۹۰۹ء کو بغاوت مکمل فرو کر کے سرکردہ علماء اور سلطان کو گرفتار کر لیا گیا اور اس کی جگہ محمد رشاد کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ یہ کامیابی دراصل شریعت حقہ کے

علمبرداروں کے خلاف اباحیت پسندوں کی کامیابی تھی۔ مشروطیت سے جو اباحیت شروع ہوئی تھی اس نے اب مکمل غلبہ پالیا چنانچہ ۱۹ ارکان اور ۱۵ علماء کو پھانسی دے دی گئی۔ اتحاد محمدی کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا اور ابھی استاد نورسی کے اوپر عدالت مقدمہ چلا رہی تھی اور شریعت کا نفاذ چاہنے کے جرم میں انہیں پھانسی پر لٹکانا چاہتی تھی کہ عدالت کے باہر ہزاروں آدمی جمع ہو گئے اور انہوں نے غیظ و غضب کا اظہار کیا جس سے خوفزدہ ہو کر حکومت نے انہیں چھوڑ دیا تاہم وہ ان پر کوئی الزام ثابت بھی نہ کر پائی تھی۔ عدالت کی تقریر ان کی مشہور تقاریر میں سے ایک ہے۔ استاد نے اس کے بعد شام کا سفر کیا اور جامعہ اموی میں تقریر کی جو خطبۂ شامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں انہوں نے عالم اسلام کے امراض گنائے ہیں۔ یہ امراض آج بھی ہمارے جسد ملی میں ناسور کی طرح پھیلے ہوئے ہیں اب بھی ضرورت ہے کہ ان کی تشخیص سے فائدہ اٹھا کر علاج کی تدبیر کی جائے۔ یہ امراض استاد کے بقول چھ ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل سے مایوسی۔ اجتماعی اور سیاسی زندگی میں صداقت اور اخلاص کا فقدان۔ دشمنی اور عداوت باہمی میں روز افزوں دلچسپی اور انہماک۔ اہل ایمان کا منظم و مربوط نہ ہونا۔ جبر و استبداد کا غلبہ اور خود غرضی مفاد پرستی اور انانیت۔

دمشق سے واپسی پر استاد ہمہ تن ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کے لئے جت گئے تاہم جلد ہی پہلی بڑی جنگ چھڑ گئی اور یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ترکی کی بقا کی اس جنگ میں استاد بھی برابر کے شریک رہے اور فوج میں داخل ہو کر اعلیٰ افسر کے مقام تک ترقی کی۔ آپ اس جنگ میں آبدوز کے ذریعہ طرابلس پہنچے اور وہاں اتحادیوں سے جنگ کی اور پھر روس کے خلاف بھی برسر پیکار رہے۔ اس جنگ میں آپ کی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی جس کی وجہ سے بالآخر روسی آپ کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ڈھائی سال کے بعد آپ قید خانہ سے بھاگ گئے اور استنبول پہنچے۔ یہاں آپ کو دارالحکمت اسلامیہ کا رکن بنا دیا گیا جو آپ کی علمی صلاحیتوں کا حکومت اور علماء کی طرف سے واضح اعتراف تھا۔ جب اناطولیہ میں تحریک آزادی اٹھی تو استاد نے اس میں بھرپور شرکت کی اور فتاویٰ تقاریر اور تحریری ذرائع سے عوام کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ برطانوی حکومت اس زمانہ میں علماء کو خرید رہی تھی تاکہ تحریک آزادی کی جڑ کاٹی جائے۔ استاد نے اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیا اور انگریز دانت پیس کر رہ گئے کیونکہ استاد کی علمی وجاہت اور تقویٰ و تدین کے مقابلہ میں ترکی عوام کسی عالم کی نہ سنتے تھے۔

۲۳ اپریل ۱۹۲۰ء کو استاد نے انقرہ میں مجلس کبیر ملی کے اجلاس میں شرکت فرمائی اور دعا

کی۔ مجلس میں استاد کی تقاریر سے ایک سو ساٹھ ارکان توبہ کر کے شعائر اسلام اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہو گئے۔ استاد نے جمہوری حکومت کو اسلام کی راہ پر ڈالنے کی بے پناہ کوشش کی تاہم اباحیت پسندوں کا غلبہ اتنا قوی تھا کہ استاد مایوس ہو گئے۔ انہی دنوں آپ کی پختہ طور پر یہ رائے بن گئی کہ مسلمان ایمان و اسلام سے ذہنی و قلبی سطح پر محروم ہو گئے ہیں اور اب ضرورت اس امر کی نہیں کہ وعظ و تلقین کے ذریعہ انہیں اسلام پر چلنے کا حکم و نصیحت کی جائے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے سینوں میں از سر نو کشت ایمان کی تخم ریزی کی جائے۔ استاد بدیع الزمان سعید نورسی نور اللہ مرقدہ چودھویں صدی کے دیگر خادمانِ دین سے اس اعتبار سے بلند اور مختلف نظر آتے ہیں کہ انہوں نے بروقت بالکل صحیح تشخیص و تجویز ہی نہیں کی بلکہ ایک انتہائی مشکل اور نامساعد دور میں کروڑوں بندگان خدا کو ارتداد سے محفوظ رکھا۔ آپ کا خیال تھا کہ ایمان کا فقدان سب مسائل اسلامیہ کی جڑ اور قرآن سے مضبوط تعلق اس مسئلہ فقدان کا حل ہے۔ آپ واحد شخص ہیں جس نے چودھویں صدی میں قرآن سے ایمان کے چھ ارکان لاکھوں سینوں میں زندہ اور روشن کر دیئے۔ آپ کے رسائل نور ایمان کا موجیں مارتا سمندر ہیں جو انہیں پڑھ لیتا ہے وہ اللہ رسول اور قرآن کا سچا محب اور آخرت کا عمدہ کاشت کار بن جاتا ہے۔ ۱۹۲۱ء سے آپ نے ایمان کی تخم ریزی کا کام کیا اور ۱۹۶۰ء تک اپنی وفات تک جاری رکھا۔ اس چالیس سالہ جدوجہد میں آپ نے حقیقی آزادی کے بحیثیت مجموعی بمشکل تمام چار پانچ سال گزارے ہوں گے۔ باقی سارا عرصہ آپ نے قید و بند جلاوطنی دربدری اور نظر بندی وغیرہ میں گزارا۔ یہی صورت حال آپ کی تحریک کے ساتھ بھی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ مقدمات نوریوں اور اخوانیوں پر قائم ہیں۔ آپ کو جیل میں کئی مرتبہ زہر دینے کی کوشش ہوئی۔ دو دفعہ یہ کوشش کامیاب بھی ہوئی تاہم اس وقت آپ جانبر ہو گئے مگر مرض الوفات میں آپ اس زہر کا اثر بہت محسوس کرتے تھے۔ آپ نے ۲۳ر مارچ ۱۹۶۰ء کو اُرفا میں انتقال فرمایا اور درگاہ خلیل الرحمٰن میں دفن ہوئے۔ جمال گرسل کے فوجی انقلاب کے بعد آپ کی نعش کو سپارٹا منتقل کر دیا گیا۔ اس وقت آپ کے انتقال پر کئی ماہ گزر چکے تھے اور لاش بالکل تروتازہ تھی۔ سب نے کہا کہ یہ ایک شہید کی نعش ہے۔

اخلاق و کردار..... استاد بدیع الزمان سعید نورسی رحمۃ اللہ علیہ انتہائی اعلیٰ اور کریمانہ اخلاق و اوصاف کے حامل تھے۔ آپ نے ساری زندگی تجرد میں گزاری کیونکہ بقولِ خود آپ

ہنگامہ آرائی کے کس لمحہ میں فرصت پاکر نکاح کرتے اور رفیقۂ حیات کے حقوق ادا کرتے۔ تاہم آپ کے تقویٰ للّٰہیت اور پاک دامنی کی تمام دنیا گواہ ہے۔ غض بصر اور عورتوں سے بات چیت نہ کرنے کا غیر معمولی اہتمام تھا۔ اکثر روزہ سے رہتے اور جس دن روزہ نہ ہوتا اس دن بھی ایک پیالہ شوربہ دو روٹیاں اور ایک گلاس پانی کا' کل غذا ہوتی۔ تنہائی نہایت مرغوب تھی اور مغرب سے لے کر دوسرے دن دوپہر تک کسی سے ملاقات نہ کرتے۔ بہت کم سوتے تھے اور رات کا بیشتر حصہ قرآن حکیم اور نماز شبانہ کی سنگتِ بابرکت میں گزارتے۔ محترمہ مریم جمیلہ نے اکل حلال کی سختی سے متعلق ان کا معمول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر مصدقہ حلال غذا میسر نہ آتی تو گھاس پات تک پر گزارہ کر لیتے مگر مشتبہ غذا کو ہاتھ نہ لگاتے۔ اپنے کھانے کا کچھ حصہ چیونٹیوں کو ضرور ڈالتے اور فرماتے کہ یہ ان کی جمہوریت کو خراج دیتا ہوں۔ حق بات ڈنکے کی چوٹ پر کہتے اور کوئی تعلیمِ مصلحت سے آشنا کرنا چاہتا تو شیر کی طرح غضب ناک ہو جاتے۔ آپ کی قید و بند اور جلا وطنیوں اور نظر بندیوں میں آپ کی اس صفت کا نمایاں ہاتھ ہے۔ شاگردوں اور چھوٹوں کی نصیحت کو تحمل سے سنتے اور پھر اصلاح کو قبول بھی کرتے۔ بچوں پر نہایت شفیق تھے ان کی گفتگو اہتمام کے ساتھ سنتے اور ان سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرتے۔ آپ فرماتے یہ رسائل نور کی آنے والی اولادیں ہیں۔ مایوس نہ خود ہوتے تھے نہ دوسروں کو ہونے دیتے تھے۔ سنت کا خصوصی اہتمام فرماتے اور دینی معاملات میں فقہی اور نظری توسع کے قائل تھے۔

ضرورت رشتہ

گریڈ ۱۸ کے سرکاری ملازم' لاہور میں اپنا مکان ہے' کے نوجوان بیٹے عمر ۲۵½ سال' تعلیم میٹرک' سرکاری ٹیکنیکل ملازمت' باشرع' پابندِ اسلامی اطوار کے لئے ہم پلہ رفیقۂ حیات بلاامتیازِ ذات تعلیم کم از کم مڈل' نیک سیرت' صوم وصلوٰۃ کی پابند' امورِ خانہ داری سے واقفیت جس کے سرپرست تنظیم اسلامی و انجمن خدام القرآن سے بالواسطہ یا بلاواسطہ دلچسپی رکھتے ہوں رجوع فرمائیں۔ نیز جہیز کی ضرورت نہیں۔ نکاح اور رخصتی مسجد سے ہوگی۔

پوسٹ بکس نمبر ۱۰۲
معرفت دفتر تنظیم اسلامی۔ ۸-۶۷ علامہ اقبال روڈ
گڑھی شاہو۔ لاہور

معدے کی تیزابیت ، بدہضمی اور بھوک کی کمی کے لیے

لیکوڈ

گیسٹوفل

تحقیق کی روایت۔ معیار کی ضمانت

QD - 6

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَأْنَا

اے ہمارے رب، اگر ہم بھول جائیں یا چوک جائیں تو (ان گناہوں پر) ہماری گرفت نہ فرما۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ

اور اے ہمارے رب، ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے اُن لوگوں پر ڈالا

عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا

جو ہم سے پہلے ہو گزرے ہیں۔

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اور اے ہمارے رب، ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوا جس کے اُٹھانے کی طاقت ہم میں نہیں ہے۔

وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا

اور ہماری خطاؤں سے درگذر فرما، اور ہم کو بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔

اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ پس کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

ہمیں توبہ کی توفیق عطا کرے

ہماری خطاؤں کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے

عطیہ اشتہار

میاں عبد الواحد

بھگوان سٹریٹ، پرانی انار کلی، لاہور

SV ADVERTISING

محمد یعقوب

مسلمانوں کی موجودہ حالت
اور
اسلامی انقلاب کی برکات

ایک بھرپور جائزہ

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی خاتم النبیین وسید المرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں قریباً نصف صد مسلمان ممالک بشمول پاکستان مغرب کے براہ راست غلبہ وتسلط سے آزاد ہوئے۔ اگرچہ ان تمام ممالک میں آزادی کی تحریکیں کم وبیش اس صدی کے شروع سے جاری تھیں لیکن ان کی آزادی ان کی تحریکوں سے کہیں زیادہ مغربی اقوام کی جنگ زرگری کا نتیجہ تھی' جنگ عظیم دوم نے انہیں وقتی طور پر اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ ان ممالک پر براہ راست سیاسی غلبہ ممکن نہیں رہا تھا۔ اس لئے مغرب نے انہیں جسمانی طور پر تو آزاد کر دیا لیکن اپنی علمی برتری' اخلاقی تفوق' معاشی استحکام اور ٹیکنالوجی کا غلام بنائے رکھا۔ ادھر چونکہ آزادی بھی خون کے عوض نہیں خریدی گئی تھی بلکہ ایک قسم کی "آئینی جدوجہد" کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھی اس لئے آزادی حاصل کرنے والوں کی اچھی خاصی اکثریت کو تو اس کا سرے سے فہم وادراک ہی نہیں تھا کہ وہ کس نعمتِ عظمیٰ سے نوازے گئے ہیں اور یہ کہ اس سلسلہ میں ان پر کیا نئی اور اہم ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ اور جس چھوٹی سی اقلیت کو اس کا احساس تھا (ان میں جاگیردار اور بیوروکریٹس پیش پیش ہیں) وہ اپنے طبقے کے مزاج کے عین مطابق ذاتی منفعتوں' گروہی مفادات کے حصول اور اس کے لازمی نتیجہ یعنی محلاتی سازشوں میں مصروف ہو گئے۔ ایک اقلِ قلیل البتہ جب سے اب تک اہلِ درد کی موجود ہے جو ظلمت کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی کے مصداق بساط بھر روشنی بکھیرتی رہی ہے۔

آزادی..... ہم عام طور پر سنتے اور پڑھتے ہیں کہ پاکستانی عوام تاہنوز آزادی کی صحیح برکات سے متمتع نہیں ہو سکے لیکن بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ "قومی آزادی" سے مراد کیا ہے۔ زیادہ تر لوگ اسے محض سیاسی آزادی یا زیادہ سے زیادہ معاشی آزادی سمجھتے ہیں حالانکہ اصل آزادی اس سے کہیں آگے کی چیز ہے۔ آزادی سے مراد مادر پدر آزادی نہیں ہے۔ ہر قوم کا ایک نظامِ حیات اور طرزِ حیات ہوتا ہے چنانچہ ہر قوم اپنی آزاد مرضی سے اپنے اس نظامِ حیات کی تابع ہوتی ہے۔ دوسری قوموں کی سیاسی غلامی کے دور میں کوئی قوم اپنے اس مخصوص نظامِ حیات پر عمل نہیں کر سکتی اسی لئے وہ آزادی کے خواب دیکھتی ہے اس کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور اس کے حصول کے لئے اپنے بہترین فرزندوں کی قربانی پیش کرتی ہے۔ اور جونہی وہ دوسری قوموں کے سیاسی غلبہ سے نجات پاتی ہے یعنی معروف معانی میں آزادی حاصل کر لیتی ہے وہ فوراً زندگی کے ہر گوشے میں اپنے مخصوص نظامِ حیات کو جاری و ساری کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے ادارے وجود میں لاتی ہے جو اس کے نظامِ حیات کو پوری قوت کے ساتھ اس کے حاصل کردہ خطۂ زمین میں رائج و نافذ کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر وہ ایسا تعلیمی نظام (تعلیمی نصاب، تعلیمی ادارے اور ماہرین تعلیم) وضع کرتی ہے جو اس کے مخصوص نظام حیات اور طرزِ زندگی کو آئندہ نسل کے ذہنوں میں نقش کر دے اور آنے والی نسلیں اس نظام حیات کی امین بن جائیں..... اسی طرح وہ ایسے معاشی، معاشرتی اور فوجی ادارے، اسی طرح مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ وجود میں لاتی ہے جو الگ الگ ہونے کے باوجود ایک حیاتیاتی اکائی کی طرح باہم دگر مربوط و معاون ہوتے ہیں۔ اور اس عمل میں وہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتی۔ یہی وہ چیز ہے جسے کسی قوم کی حقیقی آزادی کہا جا سکتا ہے۔

ہماری حالت..... اب اگر ہم اپنے گریبان میں جھانکیں اور سیاسی آزادی کے بعد کے اپنے طرزِ عمل کا جائزہ لیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی کم از کم تعریف پر بھی پورا نہیں اترتے..... پاکستان کے کسی بھی مسلمان سے پوچھ دیکھئے کہ ہمارا نظام حیات کیا ہے تو فوراً جواب ملے گا۔ "اسلام"..... اس لئے کہ اس میں دورائیں ہیں ہی نہیں۔ جنگ عظیم دوم کے بعد جس قدر ملک بھی آزاد ہوئے ان سب نے آزادی کی جنگ کسی قومیت (ایک نسل، ایک ملک، ایک زبان اور ایک کلچر کی بنیاد پر لڑی تھی۔ جبکہ تنہا پاکستان ہی وہ ملک ہے جو ایک مذہب یعنی اسلام کے نظریہ حیات) کے نام پر وجود میں آیا۔ لیکن سیاسی آزادی کے بعد ہم

نے کون سے ادارے قائم کئے جو ہمارے نظام زندگی کو تقویت دیتے؟ کیا ہم نے مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو اس نہج پر ڈالا؟ کیا ہم نے ایسا نظام تعلیم وضع کیا جو اسلام کو نئی نسل کا اوڑھنا بچھونا بنا دیتا؟ کیا ہم نے ایسے معاشی و اقتصادی ادارے قائم کئے جو ہمیں ایک طرف تو اقوام مغرب کا دست نگر نہ ہونے دیتے اور دوسری طرف اندرون ملک کے تمام طبقات میں تقسیم دولت کے عادلانہ نظام کو استوار کرتے؟ کیا ہم نے ایسے معاشرتی ادارے قائم کئے جو ملک سے غیر ملکی اثرات کو ختم کرتے اور اسلامی طرز معاشرت کو رائج و متعارف کراتے؟ کیا ہم نے ایسی بے داغ انتظامیہ کی داغ بیل ڈالی جس کی موجودگی میں کمزور طبقات مطمئن و خود پسند، اور طاقتور طبقات ہراساں و محتاط ہوتے؟

یقیناً ایسا نہیں ہوا بلکہ اس ملک کے بانی اور عظیم قائد کے آنکھیں بند کرتے ہی ملک کو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح طالع آزماؤں نے لوٹ کا مال سمجھا، ملکی سیاست پر وہ "کھوٹے سکے" مسلط ہو گئے جو قائد کی جیب میں حالات کی ستم ظریفی نے ڈال دیئے تھے، کبھی بیوروکریٹس نے نقب لگائی تو کبھی فوجی موقع شناسوں نے..... کہاں کا نظریہ حیات اور کدھر کے ادارے، بقول شاعر ؎

ہمارے ملک کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

نتیجتہً ہر شعبۂ زندگی میں وہ لوٹ مچی اور وہ ہا ہا کار ہوئی کہ الاماں! ہر کسی نے ملک کی آزادی اور سالمیت کو تو ایک طرف رکھا اور بقدر ظرف بہتی گنگا میں خوب ہاتھ دھوئے۔ ذاتی مفادات ہر دوسری قدر سے بالاتر ہو گئے۔ یہ آپا دھاپی اور افراتفری اگرچہ ہر حساس شخص پر روشن ہے تاہم یاد دہانی کے لئے قومی زندگی کے چند گوشوں کی ہلکی سی جھلک دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔

نظامِ تعلیم..... نظامِ تعلیم ہی دراصل وہ شاہ کلید ہے جس سے آزادی و سرفرازی کے تمام بند دروازے کھلتے چلے جاتے ہیں اور آزاد قومیں سب سے زیادہ دھیان اور وسائل اسی شعبہ میں کھپاتی ہیں۔ مشہور انگریز امیر البحر نیلسن نے فرانس سے واٹرلو کی بحری جنگ جیتنے کے بعد بیان دیتے ہوئے کہا تھا "ہم نے یہ جنگ کیمرج اور آکسفورڈ کے میدانوں ہی میں جیت لی تھی، لیکن بدقسمتی سے آزادی کے بعد پاکستان میں سب سے زیادہ اسی شعبہ کو نظر انداز کیا گیا۔ اس بات کی طرف قطعی توجہ نہ دی گئی کہ بچوں کو کیا پڑھانا چاہئے اور کیوں؟ نصابِ تعلیم کیا ہو۔ اور بچوں کے ذہنوں کو کس سانچے میں ڈھالنا ہے؟ تعلیمی اداروں میں حسن انتظام تو کیا فقط

انتظام بھی عنقا ہو گیا۔ بچوں میں بغیر محنت کئے نہ صرف پاس ہونے بلکہ اچھے نمبر لے جانے کا رجحان پیدا ہوا۔ ٹیوشن نے وبائی مرض کی طرح پورے نظام کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تعلیمی اداروں کے اندر سیاست در آئی۔ بچے پڑھنے پڑھانے سے بے زار اور سیاسی ہنگامہ آرائی میں مشاق ہو گئے طالب علموں کے ہاتھوں میں کتابوں کی بجائے ہتھیار ہونا قابل فخر ٹھہرا۔ ان کی نظروں میں علم کی وقعت نہ رہی تو علم دینے والے کی کیا حیثیت ہوتی؟ نچلی سطح سے لے کر اعلیٰ تعلیمی سطح تک اساتذہ بھرتی کرنے کا کوئی ایسا معیار مقرر نہ کیا گیا جو ہمارے نظریۂ حیات کے مطابق ہوتا۔ نچلی سطح پر تو بگاڑ کی انتہا ہو گئی۔ اساتذہ میں سیاسی عناصر کی ہمہ وقت مداخلت اور دھونس سے ایسے ایسے "شاہکار" گھس آئے کہ جنہیں دیکھ کر تہذیب نے آنکھیں بند کر لیں اور اخلاق نے سر پیٹ لیا۔ اعلیٰ تعلیمی سطح پر بھی محض ڈگریوں پر نظر کی گئی اور معلومات عامہ جانچی گئی۔ نظریۂ حیات سے اٹوٹ وابستگی اور تعلیم و تعلم سے طبعی میلان وہاں بھی نظر انداز ہوا۔ ہر قسم کا رطب و یابس اس حساس ماحول میں دھکیل دیا گیا۔ بعض اجنبی نظریۂ حیات کے حاملین نے تو باقاعدہ منصوبہ بندی سے تعلیمی اداروں کا رخ کیا اور طلباء کے نوخیز کچے ذہنوں میں وہ زہر ہلاہل بھرا کہ اس کی زہرناکی قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ آج حال یہ ہے کہ قوم کے حساس ترین شعبہ (نظام تعلیم) میں ایسے اساتذہ کی کثرت ہے جو یا تو غیر اسلامی نظریہ ہائے حیات میں یقین رکھتے ہیں یا پھر کسی نظریہ زندگی سے وابستہ نہیں اور محض اپنی تنخواہوں' ٹیوشنوں اور دیگر حصولِ زر کے ذریعوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الہ الا اللہ

معاشی حالت..... ہمارے ہاں رواج یہ چل نکلا ہے کہ جونہی کسی نے ملک میں موجود مختلف طبقات کے درمیان وسیع معاشی خلیج پر بات کی جھٹ سے اس پر کمیونسٹ اور "سرخا" ہونے کا لیبل لگا کر بارہ پتھر کر دیا۔ حالانکہ دولت اور وسائل دولت کا منصفانہ اور عادلانہ تقسیم اسلام کا منشاء ہے۔ اسلام ہرگز نہیں چاہتا کہ دولت اغنیاء کے درمیان ہی گھومتی رہے۔ امیر امیر تر ہوتے جائیں اور غریب غریب تر۔ ہمارے ہاں جو حالت ہے اظہر من الشمس ہے۔ ایک طرف وہ جاگیردار ابن جاگیردار ہیں جن کے محل ملک کے تمام بڑے شہروں میں موجود ان کے قدوم میمنت لزوم کے انتظار میں سالوں خالی رہتے ہیں اور ایک طرف وہ بے گھر و بے در لوگ ہیں کہ کڑکڑاتی سردیاں' برستی برساتیں اور جھلسا دینے والی گرمیاں جن کے جسم و جان کے

اندر سے گزرتی ہیں۔ ایک طرف عوام الناس خاص طور پر دیہاتیوں کے بچے ہیں کہ جن کے لئے اوّل تو سکول موجود نہیں اور اگر ہے تو وہاں بے سرو سامانی کا وہ عالم ہے کہ صحراؤں اور ویرانوں کو ان پر رشک آتا ہے اور دوسری طرف ایچی سن کالج اور اس جیسے سینکڑوں تعلیمی ادارے ہیں کہ رشک جنت و فردوس نگاہ ہیں..... ایک طرف لاکھوں بیوائیں اور ان کے بچے' لاکھوں معذور اور ان کے خاندان' لاکھوں بے وسیلہ لوگ' ہزاروں بے روزگار اور بے نور انسان حیوانوں سے بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

متوازن غذا کا تو خیر ذکر ہی کیا ہے' محض خوراک اور قوت لایموت کے حصول سے قاصر مختلف جسمانی و نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہیں' اور دوسری طرف ایک طبقہ کے کتے بھی نرم و گرم بچھونوں پر استراحت فرماتے ہیں اور بھرا پیٹ ہونے کے سبب گوشت کی ران کو محض سونگھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ ایک جانب وہ خواتین ہیں کہ جن کے محض ڈریسنگ ٹیبل کو اپ ٹو ڈیٹ رکھنے پر لاکھوں روپے ماہوار خرچ ہوتے ہیں اور دوسری جانب عورت نما مخلوق ہی عین حالتِ حمل میں بیس بیس اینٹیں اٹھا کر چار چار منزل اوپر چڑھتی اترتی ہے..... ایک طرف پانچ سے پندرہ سال کے بچے بوٹ پالش کرتے' ہوٹلوں میں برتن دھوتے' بسوں اور ٹرکوں کے اڈوں پر سامان ڈھوتے اور مستریوں کے پاس یا چھوٹی چھوٹی فیکٹریوں میں کمر توڑ مشقت کرتے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اسی عمر کے بچے زرق برق لباسوں میں چمکتی کاروں پر اعلیٰ درسگاہوں کو اس شان سے جاتے ہیں کہ سکول کے گیٹ سے کلاس روم تک بستہ اٹھا کر لے جانے کے لئے ایک مودب نوکر ساتھ ہوتا ہے۔ اور تشویش ناک بات یہ ہے کہ ان دو طبقات کے درمیان یہ فرق و تفاوت روز بروز گہرا اور وسیع ہوتا جا رہا ہے ملکی معیشت نام کی کوئی شے اپنا وجود نہیں رکھتی' محض غیر ملکی قرضوں پر گزارہ ہو رہا ہے۔ اور قرضوں کے سود کی ادائیگی کے لئے مزید قرضے حاصل کرنا ہی خارجہ پالیسی کی کامیابی سمجھا جا رہا ہے۔ جو غیر ملکی قرضے حاصل کئے جاتے ہیں انہیں غیر پیداواری منصوبوں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ ان قرضوں کا ایک بہت بڑا حصہ تو قرض دینے والا ملک اپنے مشیروں اور ماہرین کی گراں قدر تنخواہوں کی صورت میں واپس لے لیتا ہے اور جو کچھ باقی بچتا ہے وہ ملکی بیوروکریٹس اور ماہرین کی نذر ہو جاتا ہے عوام کے حصے میں محض قرضے کا بوجھ آتا ہے۔ ملک کا خزانہ اس حد تک خالی ہے کہ شاید چند سالوں تک حکومت کو ملازمین کی تنخواہ کی ادائیگی کے لئے بھی اندرونی و بیرونی قرضوں پر انحصار کرنا پڑے۔ ملک دیوالیہ ہو چکا ہے لیکن آپ ذرا ایک نظر بڑے بڑے افسروں کے دفاتر میں جھانک کر دیکھیں تو آپ وہاں عیش و

عشرت کے وہ وہ سامان پائیں گے کہ آپ کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ جائے۔ یہ محض دفتروں کا حال ہے دیگر الملے تللے اس پر مستزاد ہیں۔ ٹیکس دہندگان کی تمام تر ذہانت اور صلاحیت اس کوشش میں صرف ہوتی ہے کہ کسی طرح ملکی خزانے میں ایک پیسہ نہ جانے پائے اور سرکاری ملازمین ان کی اس کوشش میں پورا پورا تعاون کرتے ہیں۔

بڑے بڑے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو بے دریغ قرضے جاری کئے جاتے ہیں اور وہ انہیں شیرمادر کی طرح ڈکار جاتے ہیں اور حکومت کمال فراخدلی سے ان کی معافی کا اعلان بھی کر دیتی ہے اور عوام کے سامنے ان مگرمچھوں کے نام تک نہیں آنے دیئے جاتے..... یہ محض ایک ہلکی سی جھلک ہے' ذہین قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

معاشرتی حالت..... ہمارا معاشرہ اب کوئی منظم معاشرہ نہیں رہا۔ دس کروڑ عوام مختلف قسم کے افقی اور راسی طبقات اور گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پھر یہ گروہ بھی منظم نہیں ہیں بلکہ آگے گروہوں اور ٹولیوں میں منقسم ہیں۔ اگر کوئی منظم ہے تو بس سرمایہ دار' جاگیردار اور بیوروکریٹس' دیہات میں تو حالت اور زیادہ دگرگوں اور انسانیت کے دامن پر بدنما داغ کی مانند ہے۔ ہندو منوسمرتی کا وہاں مکمل راج ہے۔ دیہی معاشرہ برہمن' کشتری' ویش اور شودر میں نہ سہی زمیندار اور کمی کے نسلی گروہوں میں تقسیم ہے۔ کمی کا لفظ بولنا اور استعمال کرنا اگرچہ قانوناً ممنوع ہے لیکن عملاً دھڑلے سے بولا بھی جارہا ہے اور برتا بھی..... بے چارے دھوبی' موچی' نائی' مراثی اور دیگر پیشہ ور صدیوں سے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ یہ مسئلہ معاشی نہیں ہے جیسا کہ زیادہ تر لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ خالصتاً ایک معاشرتی روگ ہے۔ ان "کمیوں" میں بے شمار ایسے بھی ہیں جو معاشی خوشحالی میں زمینداروں سے بھی بڑھے ہوئے ہیں لیکن زمیندار طبقہ انہیں جس حقارت سے دیکھتا اور سلوک کرتا ہے وہ ناقابل برداشت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ شہروں کا رخ کر رہے ہیں اور یوں شہروں میں مزید معاشرتی اور انتظامی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ انتخابات سے ان لوگوں کو بجائے فائدے کے الٹا نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ یونین کونسل کی ممبری' چیئرمین شپ اور کونسلری سے لے کر صوبائی اور قومی اسمبلی کی نشستوں تک ہر جگہ زمیندار طبقہ ہی چھایا ہوتا ہے۔ اپنی تمام تر نیکی' ذہانت اور تعلیم کے باوجود بیچارے کمیوں کی کیا مجال ہے کہ وہ زمیندار کے مقابلے میں کھڑا ہو جائے؟ نتیجتاً عوامی نمائندگی کے عہدوں پر قابض ہونے کے بعد زمیندار طبقہ اور زیادہ مضبوط ہو کر "کمیوں" کے لئے مزید وحشت اور دہشت کا سبب بن

جاتا ہے۔

رشوت، غبن اور بد عنوانی..... رشوت ستانی ایک قدیم روگ ہے اور ہر زمانے میں اس کا چلن رہا ہے۔ حتیٰ کہ انگریز کے زمانہ اقتدار میں بھی جو کم از کم انتظامی لحاظ سے ایک مضبوط زمانہ تھا لوگ رشوت لیتے دیتے تھے مگر بہت چھپ چھپا کر اور ڈر ڈرا کر۔ لیکن اب تو اس کا وہ زور ہے اور یوں سینہ زوری سے لی جاتی ہے بلکہ اپنا حق سمجھ کر دھڑلے سے وصول کی جاتی ہے کہ الاماں والحفیظ۔ غبن و بد عنوانی اس پر مستزاد ہے۔ اس کی بے شمار وجوہات میں سے ایک بڑی وجہ زمیندار طبقہ کا سرکاری ملازمتیں اختیار کر لینا ہے۔ یہ طبقہ رشوت لینے میں بڑا دلیر ہوتا ہے اس وجہ سے کہ انہیں اپنی ملازمت کے کھٹائی میں پڑ جانے کا کوئی ایسا غم نہیں ہوتا۔ ملازمت نہ بھی رہے تو آبائی زمین تو کہیں گئی نہیں۔ دوسری وجہ یہ کہ علاقہ کا ایم پی اے بھی اپنا اور ایم این اے بھی اپنا۔ سیّاں بھئے کوتوال اب ڈر کاہے کا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رشوت صرف یہی طبقہ لیتا ہے دوسرے بھی لیتے ہیں لیکن رشوت، بد عنوانی اور غبن میں دیدہ دلیری اسی طبقہ کی پیدا کردہ ہے۔

رسوماتِ قبیحہ..... شادی بیاہ پر بے تحاشا خرچ کرنا، لڑکیوں کے لمبے چوڑے جہیز، سینکڑوں افراد پر مشتمل براتیں اور پھر ان کی پر تکلف دعوتیں، نمائشی اور آرائشی روشنیوں کی چکاچوند، بینڈ باجے، آتش بازی اور اسی طرح کی دوسری لغویات اور دولت کی نمائش بھی زیادہ تر ایسے طبقے کی طرف سے ہوتی ہے جس کے ہاں مالِ حرام وافر تعداد میں پہنچتا ہے۔ انہیں دیکھ دیکھ کر عام آدمی کے دل و دماغ میں بھی ایسے ہی خواب جنم لیتے ہیں اور جب وہ اپنی حقیر کمائی سے ایسا نہیں کر سکتا تو ایک طرف جرائم پیشگی اور دوسری طرف نفرت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور یوں معاشرتی مسائل مزید گھمبیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

سرکاری محکمے اور ادارے..... جیسا کہ آپ جان چکے ہیں رشوت، بد عنوانی اور غبن سرکاری محکموں کا عام چلن بن چکا ہے۔ بیچارے غرباء اور ضعفاء ہاتھوں میں درخواستیں پکڑے دفاتر کے چکر پر چکر کاٹتے رہتے ہیں اور کہیں کوئی فریاد رس نہیں پاتے۔ بڑے افسروں کے دروازے بند اور دور باش کی صداؤں سے گونجتے ہیں اور ماتحت عملہ بالعموم تن آسان، نا اہل اور بسا اوقات حرام خور ہوتا ہے۔ سائل کدھر جائے؟ مثال کے طور پر صرف دو حکومتی اداروں کا ہلکا سا خاکہ پیش ہے۔

واپڈا..... یہ ایک ملک گیر ادارہ ہے اس کے پاس بے شمار وسائل اور افرادی قوت ہے یہ سستی بجلی پیدا کرتا ہے اور مہنگے داموں مہیا کرتا ہے۔ پھر بھی یہ سدا مقروض اور مسلسل گھاٹے میں ہے۔ وجہ؟ اس کے ملازمین اسے کھائے چلے جارہے ہیں اور بجائے اس کی روک تھام کے بجلی کے نرخ کسی اعلان وجواز کے بغیر مسلسل بڑھائے جارہے ہیں اور اس نرخ بالا کن کا سلسلہ کہیں ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔

ریلوے..... بالکل یہی حال ریلوے کا ہے۔ گاڑیوں میں رش کا وہ عالم ہوتا ہے کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی اور آمدن کا پوچھو تو مسلسل خسارہ! وجہ وہی کہ باڑ کھیت کو کھائے جارہی ہے۔ اس کے ملازمین ہی اسے نگلے جارہے ہیں اور قرض پر گزارہ چل رہا ہے۔

سیاسی صورت حال..... "سیاست" ایک معزز ترین کام بلکہ مسلسل محنت کا نام ہے۔ کیونکہ اہل سیاست کا کام انسانی گروہوں اور منتشر افراد کو متحد کرنا، منظم و منضبط معاشرے تشکیل دینا، ضعیف و ناتواں اور طاقتور و مضبوط کے درمیان قانون کی عملداری قائم کرنا نیز انسانوں کی صلاحیتوں اور قوتِ کار کو ایک مثبت رخ پر چلا کر انسانیت کو اوجِ کمال کی طرف لے جانا ہوتا ہے۔ اسی لئے امام الرسل صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "یہود کی سیاست ان کے انبیاء کرتے تھے" لیکن اس مملکت خداداد میں اگر آپ ایک عام دیہاتی، مزدور یا ٹھیلے، تانگے والے سے پوچھیں کہ سیاست کا کیا مطلب ہے تو وہ فوراً کہے گا "عیاری، مکاری، بددیانتی اور فریب دہی" کبھی آپ نے سوچا سیاست کا یہ مفہوم انہوں نے کیوں اور کیسے اپنایا؟ دراصل یہ ایک بڑی دردناک حقیقت ہے۔ قائد اعظم کے بعد سے ہماری سیاست جاگیرداروں کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی رہی ہے۔ پاکستان سے پہلے ان کی مخصوص شکارگاہیں ہوا کرتی تھیں جہاں وہ ہرنوں اور گیدڑوں کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ پاکستان کے بعد انہوں نے پورے ملک کو اپنی شکارگاہ قرار دے لیا اور یہاں انسانی عزتِ نفس کا شکار کھیلنے لگے ہے

کیوں نہ جنت کو بھی دوزخ میں ملائیں یارب
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی!!

جاگیرداروں کے پاس (جو کہ اب تیزی سے صنعت کار اور سرمایہ دار بھی بنتے جارہے ہیں) وقت اور دولت کی فراوانی ہے۔ لہٰذا یہ وادی ان کے لئے بڑی کشش رکھتی ہے۔ اس لئے کہ قبل پاکستان ان کی جاگیر کی حدود میں انسانی سر ان کے آگے سجدہ ریز ہوتے تھے۔

اب موقع آیا کہ پورا ملک نہیں تو کم از کم پورا صوبہ ان کی سلامی میں کھڑا رہے۔ ادھر نظام بھی ایسا تھا کہ کوئی انہیں عوامی نمائندہ منتخب ہونے' وزارتوں کے قلمدان سنبھالنے اور ملک کے سیاہ و سپید کا مالک بن جانے سے نہیں روک سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اس نوزائیدہ ملک کے سیاسی افق پر کالی گھٹاؤں کی طرح چھا گئے۔ اب ان کی "اہلیت" تو صرف یہ تھی کہ وہ جاگیردار تھے اور مقصد صرف اپنے طبقے کے مفادات کی حفاظت اور شخصی سربلندی تھا..... ملک و قوم کی سربلندی' نظریۂ حیات کا استحکام' دوررس منصوبہ بندی' جدید تعلیم اور ٹیکنالوجی کا فروغ' عظیم انسانی قدروں کا احیاء' ملک میں موجود صلاحیتوں کا بھرپور استعمال' آئندہ نسلوں کی تیاری کے لئے ایک مضبوط اور خود کار نظام کا قیام وغیرہ سب ان کے لئے بے معنی چیزیں تھیں حتیٰ کہ روزمرہ کے حکومتی امور کی انجام دہی کا دماغ بھی ان کے پاس نہیں تھا چنانچہ انہوں نے زیادہ سے زیادہ بیوروکریسی پر انحصار کیا۔ وہ بیوروکریسی جو سالہا سال کی محنت سے انگریز بہادر نے غلام قوم پر اپنا شکنجہ مضبوط رکھنے کے لئے تیار کی تھی' جسے صرف اس بات کی تربیت دی گئی تھی کہ نظم و نسق (Law & Order) کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہونے دیں یا دوسرے لفظوں میں رعایا کو چوں چرا نہ کرنے دیں۔ چنانچہ بیوروکریسی نے ابتداء میں یہ کام بحسن و خوبی انجام دیا۔ لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ ہمارے موجودہ آقا انگریز آقاؤں کی طرح آگاہ' سرگرم اور باصلاحیت نہیں ہیں تو ان کے دلوں میں خود آقا بن جانے کا سودا سمایا اور وہ فی الواقع آقا بن بیٹھے..... ایسی حالت میں فوج کیوں پیچھے رہتی' جرنیلوں کو بھی حکمرانی کا شوق چرایا اور چونکہ ان کے پاس "قوت" کا استحقاق بھی تھا لہٰذا کون روک سکتا تھا؟

سیاسی جماعتیں..... دنیا کے عام چلن کے مطابق اس بدقسمت ملک میں بھی سیاسی جماعتیں رہی ہیں اور ہیں۔ سب سے پہلے تو مسلم لیگ کا ذکر کرنا چاہئے کہ بلاشبہ پاکستان کے قیام میں اس " جماعت " کے قائدانہ رول کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن "مسلم لیگ" ایک جماعت کی بجائے ایک شخص کا نام تھا۔ محمد علی جناح ہی مسلم لیگ تھے۔ کیونکہ اگر یہ واقعی کوئی جماعت ہوتی تو قائد کی وفات کے بعد بھی " قائم " رہتی۔ جماعتوں کو افراد کی موت سے کوئی گزند نہیں پہنچا کرتا۔ اور اب تو "مسلم لیگ" (اگر کہیں ہے تو) محض جاگیرداروں اور طالع آزماؤں کی پناہ گاہ کا نام ہے۔ باقی سیاسی جماعتوں کو تین واضح گروپوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ا۔ **مذہبی سیاسی جماعتیں**..... ان میں سے صرف جماعت اسلامی ہی قدیم بھی ہے اور غیر فرقہ وارانہ بھی..... لیکن اب اس کی یہ حالت ہے کہ دین کو توثانوی حیثیت حاصل ہے اور سیاست کو اولیت دی جاتی ہے اور وہ بھی انتخابی سیاست کو۔ اس طرح اس نے گویا حصولِ اقتدار کو اپنا نصب العین اور دوسری سیاسی جماعتوں اور اقتدار پسند عناصر کو اپنا حریف بنا لیا ہے۔ اس طرح اس کے میدانِ عمل میں تنگی اور محدودیت پیدا ہو گئی ہے۔

دوسری مذہبی سیاسی جماعتیں خالصتاً فقہی فرقوں پر مشتمل ہیں اور اس طرح گویا انہوں نے خود ہی اپنے کو محدود کر لیا ہے۔

ب۔ **سیکولر سیاسی جماعتیں**..... اس گروپ میں مسلم لیگ، پاکستان پیپلز پارٹی، نیشنل پیپلز پارٹی، تحریک استقلال وغیرہ اہم ہیں یہ اگرچہ کسی خاص طبقے اور فرقے تک محدود نہیں ہیں لیکن اول تو لوگ انہیں آزما چکے ہیں۔ دوسرے ان جماعتوں میں وہ جاگیردار، سرمایہ دار اور بیوروکریٹس گھسے ہوئے ہیں جو ہمارے ملک کی ابتر صورت حال کے اصل ذمہ دار ہیں۔

ج۔ **علاقائی جماعتیں**..... اس میں بے شمار چھوٹے چھوٹے گروہ شامل ہیں جو زیادہ تر بعض شخصیتوں کے گرد گھومتے ہیں اور گروہی مفادات کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ ملک گیر سیاست میں قطعاً بے اثر لیکن بعض وقتی اور علاقائی عصبیتوں کے علمبردار اور نظم و نسق کے مسائل پیدا کرنے کے اہل ہیں۔ ان ہی میں بعض گروہ علی الاعلان پاکستان کو توڑنے اور اسلام کو ختم کرنے کی باتیں بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ سب سیاسی جماعتیں زیادہ تر اپنے قائدین کے اخباری بیانوں کی حد تک زندہ ہیں۔ عوام کی سیاسی تربیت، اپنے کارکنوں سے گہرا ذاتی رابطہ اور ان کی تعلیم و تربیت، اپنے ولولہ انگیز پروگرام کے بل بوتے پر نچلی سطح پر عوام میں نفوذ، نظم و ضبط، دنیا کے جدید ترین رجحانات کا مطالعہ اور روح عصر سے آگاہی، اس علم اور آگاہی کی روشنی میں اپنے لائحہ عمل اور طرز عمل میں انقلابی تبدیلیاں، عوام کی نفسیات سے آگاہی اور اندرون ملک اور بیرون ملک عوام کے اذہان پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کا علم اور اس طرح کی بے شمار چیزیں جو سیاسی جماعتوں کے لازمے کی حیثیت رکھتی ہیں یہاں مفقود ہیں۔ لہٰذا ان سے کوئی بڑی بڑی امیدیں وابستہ کر لینا اور ملک و قوم کی فلاح و فوز کے لئے ان کی طرف دیکھنا محض خوش فہمی ہے۔

دینی حالت..... اگر تو دین محض نماز روزے کا نام ہوتا تو بلاشبہ ۱۰ فیصد آبادی کو "دینی" قرار دیا جاسکتا تھا۔ (اس لئے کہ زیادہ سے زیادہ اتنے فیصد لوگ ہی اس کی پابندی کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ہر قسم کے اعداد و شمار جمع کئے جاتے ہیں لیکن اس طرف کبھی کسی کا خیال ہی نہیں گیا کہ ایک "مسلم ملک" میں پنج وقتہ نمازیوں کا شمار ہی کر لیا جائے) لیکن دین ان شعائر اسلامی کے ساتھ ساتھ اجتماعی عدل کا نام بھی ہے۔ (لیقوم الناس بالقسط) نماز روزہ کے پابند تو اس معاشرے میں مل ہی جاتے ہیں' عدل اجتماعی کا تو نام و نشان تک نہیں ہے۔ ہر فرقے کے چوٹی کے علماء تو شاید اس سے واقف ہوں لیکن مساجد کے عام ائمہ بھی اس حقیقت سے ناواقف محض ہیں۔ ان کا کام بالعموم اسلام کے نام پر اپنے اپنے فرقے کا پرچار کرنا' دوسروں کی تکفیر کرنا' فقہی اختلافات کو اچھالنا' بال کی کھال کھینچنا' خالص کلامی مسائل کو ان پڑھ عوام کے ہاتھوں میں دے دینا اور اس طرح افتراق و انتشار کو ہوا دینا ہے۔

دوسری طرف تصوف کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بھی عیاں راچہ بیاں کے مصداق سب پر کھلا ہے۔ تہذیب الاخلاق اور مکارم اخلاق جو تصوف کا اصل ہدف تھے زیب طاق نسیاں ہو چکے ہیں۔ زیادہ تر زور شیخ پرستی' قبر پرستی' میلوں ٹھیلوں اور عرسوں پر ہے۔ چند خدا ترس مشائخ کو چھوڑ کر اکثریت دوکانداری کر رہی ہے عوام کو مختلف توہمات میں مبتلا کر کے شرک و بدعت اور غیر اسلامی شعائر کا پرچار ہو رہا ہے۔ تعویز گنڈوں' جھاڑ پھونک اور شفاعت باطلہ کے نام پر غریب جاہل عوام کا استحصال روز افزوں ہے۔

ملک کے نظم و نسق کا حال..... پولیس اور عدالتوں کا اصل کام کمزوروں کو زبردستوں کے ظلم و زیادتی سے بچانا ہوتا ہے۔ پولیس کے ذمے ہے کہ وہ ظلم کو اس کے وقوع سے پہلے روکے اور کمزوروں کے حقوق کی نگرانی کرے اور اگر ظلم و زیادتی اور حقوق کی پائمالی وقوع پذیر ہو ہی جائے تو ایسا کرنے والوں کو جلد از جلد عدالت کے سامنے پیش کرے۔ یہ عدالت کا کام ہے کہ وہ فوری طور پر حقدار کو حق دلائے اور کسی قسم کے دباؤ میں نہ آئے..... اب ذرا پولیس کی کارکردگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالئے۔ ہے کوئی کل سیدھی؟ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر کہئے کیا ہماری پولیس مظلوموں کی ہمدرد ہے؟ ضعیفوں کی پناہ گاہ ہے؟ کمزوروں کی آخری امید ہے؟ بلکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ کسی غریب کے ہاں چوری ہو جائے' ڈاکہ پڑ جائے یا فریب دہی سے اس کی عمر بھر کی محنت شاقہ کی کمائی لٹ

جائے' پولیس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی بلکہ پولیس رپورٹ تک درج کرنے سے محترز رہتی ہے۔ ہاں کسی "پہنچ والے" کا معمولی نقصان بھی ہو جائے تو پورے محلے اور پورے گاؤں کو پیٹ میں لے لیا جاتا ہے۔ قتل کی صورت میں البتہ پولیس پہنچتی ہے تاکہ ایک سیدھے سادے کیس کو اپنی دانشمندی سے الجھا کر پیچیدہ بنا سکے..... اسی کا ایک شعبہ ٹریفک پولیس ہے جو ٹریفک کے بے عیب بہاؤ میں تو کوئی کردار ادا نہیں کرتی البتہ اس کی اپنی چاندی ہوتی رہتی ہے آدھی پولیس تو ہر وقت "مشاہیر قوم" کی آؤ بھگت' ان کی حفاظت و سہولت اور ناز برداری میں لگی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قتل' چوریاں' ڈاکے' بینک ڈکیتیاں' دنگے فساد' مار پیٹ اور کمزوروں کے حقوق کی پامالی وسیع پیمانے پر جاری ہے اور دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ کسی کا گھر اگر محفوظ ہے تو محض تائید قدرت کی بدولت' کسی عورت کی عزت محفوظ ہے تو فضل ایزدی سے۔ ملکی انتظام و انصرام کا یہ حال ہے کہ ع نے ہاتھ باگ پر ہے نے پائے رکاب میں۔

تبدیلی کے امکانات؟..... ملک کی صورت حال اس سے کہیں زیادہ خستہ و خراب ہے جس کا ایک اجمالی سا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ہمسایہ طاقتوں کی رال پاکستان پر ٹپک رہی ہے اور اس کے بعض بدخواہ بھی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے لئے سرگرم ہو گئے ہیں..... ہمیشہ حکمران طبقہ (جاگیردار' سرمایہ دار' افسر شاہی) نظام میں کوئی تبدیلی لانا ہی نہیں چاہتا۔ اس لئے کہ اسی نظام اور ایسی ہی صورت حال میں ان کا بھلا ہے۔ وہ بھلا ایسے نظام کو کیوں بدلیں گے جس میں انہیں خدائی اختیارات حاصل ہیں بلکہ ان کی تو پوری کوشش ہوگی کہ صورت حال میں سرمو فرق نہ آئے اور حالات جوں کے توں (Status Quo) رہیں۔ سیاسی جماعتیں اس کو یوں نہیں بدل سکتیں کہ اول تو کوئی ایسی سیاسی جماعت ہے نہیں جو عوام کی عظیم اکثریت کے دلوں کی دھڑکن بن جائے۔ اس لئے کہ عوام کو باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت افقی اور راسی سینکڑوں خانوں میں تقسیم در تقسیم کیا جا چکا ہے۔ دوسرے سیاسی جماعتوں میں باہم اس قدر سر پھٹول' منافرت اور بُعد ہے کہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ تیسرے یہ کہ عوام میں ابھی وہ سیاسی شعور اور کس بل نہیں ہے کہ وہ جاگیرداروں کی جاگیروں میں رہتے ہوئے ان کے خلاف ووٹ دے سکیں لہٰذا انہیں اسمبلیوں میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا جو اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ چوتھے یہ کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کو چھوڑ کر باقی تمام سیاسی جماعتوں کی باگ ڈور اور لیڈر شپ انہی وڈیروں کے ہاتھ میں ہے۔

کوئی جماعت بھی کامیاب ہو حکومت وڈیروں ہی کی بنے گی..... اور اگر کہیں پانسا پلٹتا نظر آیا تو مارشل لاء کا عفریت سر پر سوار!..... ایک اور مؤثر عنصر یہ ہے کہ ذرائع ابلاغ اور عوام سے رابطے کے تمام وسائل انہی طبقات کے قبضے میں ہیں لہٰذا معاشرے پر ان کی گرفت مضبوط ہے۔

کیا کیا جائے؟..... حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں کسی آئینی اور قانونی طریقے سے کوئی بڑی تبدیلی لانا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے کہ آئینی اور قانونی طریقے سے صرف حکومت کو تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ پورے نظام کو تبدیل کر دینا کسی بھی طرح اور کبھی بھی ممکن نہیں ہوتا..... اور پاکستان میں محض حکومت کو تبدیل کر کے کسی بڑی تبدیلی کی توقع رکھنا حماقت ہے..... حکومتیں اس سے پہلے بھی تبدیل ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی مگر عوام اور ہمارے مخصوص طرز زندگی میں کبھی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور نہ ہوگی اس لئے کہ معاشرہ میں ایک طاقتور، مؤثر اور منظم طبقہ سرے سے کوئی تبدیلی چاہتا ہی نہیں اور جو لوگ تبدیلی چاہتے ہیں وہ فی الحال اس قابل نہیں کہ کوئی تبدیلی (آئین کے اندر رہتے ہوئے) لاسکیں۔

انقلاب..... پاکستان کے مخدوش اور ابتر حالات، اسلام سے کھلی بیزاری بلکہ بغاوت، کمزور اور ناتواں طبقوں کا استحصال، امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال، مسلسل گرتا ہوا معاشی گراف، بدنظمی، رشوت، نااہلی، غبن اور سرکاری ملازمین کی من مانی، بیرونی مداخلت کا خطرہ اور اندرونی فسادیوں کی ریشہ دوانیاں اس بات کی مقتضی ہیں کہ یہاں ہمہ گیر اسلامی انقلاب برپا کیا جائے..... ایک ایسا انقلاب جو نیچے سے اوپر تک سب کچھ بدل کر رکھ دے۔ اس لئے کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ جہاں عام اور معروف طریقوں سے تبدیلیاں نہ لائی جا سکتی ہوں اور جہاں فرسودہ اور متعفن نظام نے عوام الناس کی زندگی اجیرن کر رکھی ہو اور جہاں ایک قلیل لیکن مکروہ طبقہ کروڑوں لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہو وہاں انقلاب لازمی اور لابدی ہو جایا کرتا ہے۔ پاکستان میں ایسی ہی صورت حال ہے بلکہ اس سے بھی کئی گنا خوفناک..... چنانچہ ہمہ گیر انقلاب کے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ ع

جزدار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گناہ گار سوئے دار چلے ہیں

مغرب میں انقلاب فرانس نے پورے یورپ میں زندگی کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔

ظلم و جہل کی تاریکیوں میں بھٹکنے والوں نے ایک انقلاب کی بدولت ساری دنیا کی سیاسی اور علمی قیادت سنبھال لی..... مشرق میں روس و چین نے اشتراکی انقلاب کے ذریعے اپنے مردہ اور سڑے ہوئے معاشروں کو حیات نو عطا کی اور آگے بڑھ کر سپر طاقتوں کی صف میں قدم رکھا..... اور وہ مسلم امّہ جس نے کئی صدیوں تک دین اور دنیا دونوں جہتوں میں اپنی سیادت و قیادت کے پھریرے لہرائے تھے' انقلاب سے بدکنے اور خوفزدہ ہونے کے باعث آج خستہ و ماندہ سسک رہی ہے۔ حالانکہ ع جس میں ہو نہ انقلاب موت ہے وہ زندگی

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

انقلاب کیسے ؟..... اس مختصر مضمون میں اس عظیم موضوع کو سمیٹنے کی گنجائش نہیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ ایسے مخلص لوگ جو قلب کی گہرائیوں سے یہ چاہتے ہوں کہ یہاں اسلامی انقلاب آئے اور وہ اس پر اپنا تن من دھن نچھاور کرنے کے لئے آمادہ و تیار ہوں۔ ہر مصیبت جھیلنے اور ہر مشقت اٹھانے میں بے باک ہوں' اپنے اور اپنے گھر والوں کی حد تک شعائر اسلامی کے پابند ہوں' کبائر سے مجتنب اور صغائر کے ترک میں کوشاں ہوں..... اور وہ کسی ایک قیادت کے ہاتھ میں بیعت کر کے ایک متحد' منظم اور ایثار پیشہ جماعت میں ڈھل جائیں۔ اطاعت امیر اور نظم و ضبط کے خوگر ہوں' اپنی مرضی اور رائے کو ترک کرنے والے اور مکمل طور پر امیر کے اشارۂ آبرو کے منتظر ہوں۔ یاد رہے کہ اطاعت صرف معروف میں ہوتی ہے۔ جب ایک ایسی جماعت تیار ہو جائے اور وہ تربیت و آزمائش کی بھٹی میں سے گزر چکے اور ان کی تعداد بھی "معقول" ہو جائے تو "منکرات" کے خلاف پرامن مظاہرے' پکٹنگ اور احتجاج سے اپنا جہاد شروع کر دے۔ پھر اس کے بعد آنے والے حالات خود اس کے لئے عمل کی راہیں اور جہاد فی سبیل اللہ کے دروازے کھولتے چلے جائیں گے..... حتیٰ کہ برائی کی تمام قوتیں اور مسلم معاشرہ کی گردنوں پر سوار گمراہ اور ظالم طبقہ سرنگوں ہو جائے..... اور جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا کا ربانی فیصلہ پورا ہو جائے۔

انقلاب کا نتیجہ..... یاد رہے کہ انقلاب کبھی "پرامن" نہیں ہوتا۔ ہاں حسن تدبیر سے اور اللہ کی تائید و نصرت سے خون خرابے کو کم سے کم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے نتیجہ میں بے پناہ انسانی توانائی پیدا ہوتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی ایٹم کے مرکزے (نیوکلس) کو

پھاڑا جائے تو توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح جب کسی نظام کے نیوکلس کو پھاڑا جائے تو بے شمار انسانی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ ہوتا دراصل یوں ہے کہ اس زوال آمادہ معاشرہ میں بے شمار انسانی صلاحیتیں (Talent) بے استعمال اور بے فائدہ اور بے سمت موجود ہوتی ہیں۔ انہیں استعمال میں لانے والا' انہیں ایک رخ دینے والا اور انہیں مجتمع (Pool) کرنے والا نہیں ہوتا۔ انقلاب کے نتیجے میں یہ سب Talent ایک نئے جوش و خروش اور نئے ولولے کے ساتھ ابھرتا ہے اور قوم کے رگ و ریشے میں خون تازہ کی طرح دوڑتا ہے۔ چنانچہ وہ منزلیں جو خواب و خیال دکھائی دیتی تھیں ایک حقیقتِ ثابتہ کی طرح قدموں میں آن گرتی ہیں۔ سالوں کے کام لمحوں میں ہوتے اور کٹھن راہیں پل بھر میں طے ہوتی ہیں..... ملک میں چونکہ کوئی مؤثر مخالف اور منفی قوت باقی نہیں رہتی اس لئے پوری قوم متحد' منظم اور پرجوش ہو جاتی ہے جس سے ترقی کا گراف ۹۰ درجے پر اٹھتا اور اٹھتا ہی چلا جاتا ہے۔ قوم اپنے پسندیدہ نظام حیات اور طرزِ زندگی کی طرف لوٹ آتی ہے جیسے مچھلی پانی میں آ جائے۔ غرض انقلاب نام ہے حیات نو اور زندگی تازہ کا۔

انقلاب کے ثمرات و برکات..... اس میں شک نہیں کہ انقلاب کے لئے کچھ قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ کچھ سرفروشوں کو بنیاد کی اینٹیں بننا پڑتا ہے لیکن اس سے ایک بیمار معاشرہ از سرِ نو صحت مند' توانا اور پرجوش ہو جاتا ہے اور انقلاب کا قائد اگر اس جوش و جذبہ اور ابلتی ہوئی توانائی کو مثبت سمت میں کامیابی سے ڈھال سکے اور قوم میں صحیح اسلامی سپرٹ پیدا کر سکے تو اس کی برکات سے نہ صرف آئندہ آنے والی سینکڑوں نسلیں متمتع ہوتی ہیں بلکہ ایسا خالص اسلامی انقلاب ملک کی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں رہتا اور ایک چشمہ صافی کی طرح ابل ابل کر پوری مسلم ملت کو سیرات کر دیتا ہے۔ پوری امت اس سے حیات نو اور جذبہ تازہ حاصل کرتی ہے۔

انشاء اللہ انقلاب کے بعد اسی پاکستانی قوم کو جو اب آپ کو از کار رفتہ، رشوت، بددیانتی اور خود غرضی میں ڈوبی ہوئی دکھائی دیتی ہے' پہچان نہیں سکیں گے..... زندگی کے ہر شعبہ میں اور حیات کے ہر گوشہ میں ایسی ایسی تبدیلیاں آئیں گی کہ قلم انہیں لکھنے سے عاجز اور نطق انہیں بیان کرنے سے قاصر ہے۔ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

۱۔ مثال کے طور پر تمام جاگیریں ختم کر دی جائیں گی اور زمین کی ملکیت کی حد مقرر کر دی جائے گی جس سے ایک طرف وہ طبقہ ختم ہو جائے گا جو قوم کی گردن پر پیر تسمہ پا کی طرح سوار ہے اور دوسری طرف ہزاروں بے زمین ہاریوں کو زمین مل جائے گی جہاں وہ جی جان سے محنت کر کے اناج کے ڈھیر لگا دیں گے۔

۲۔ **تعلیمی انقلاب**..... ملک و قوم کے تمام تر وسائل کا بڑا حصہ تعلیمی نظام کی تعمیر نو اور اس کے پھیلاؤ میں صرف کیا جائے گا۔ اور یہ تعلیم بے مقصد' بے سمت' بے اخلاق اور بے دین نہیں ہوگی۔ بلکہ پوری ذمہ داری اور منصوبہ بندی سے چند ہی سال میں سو فیصد شرح تعلیم حاصل کر لی جائے گی۔ اور چونکہ یہ تعلیم علوم جدیدہ کے ساتھ ساتھ گہری دینی سمجھ بوجھ بھی پیدا کرے گی اس لئے وہ جہل اور توہمات جو معاشرہ کو گھیرے ہوئے ہیں از خود کافور ہو جائیں گے۔

۳۔ **معاشی انقلاب**..... سود (جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلان جنگ ہے) کا بلکلیہ ختم کر دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اندرون ملک سرمایہ داری کی جڑ کٹ جائے گی اور بیرون ممالک تمام قرضوں کا صرف اصل زر ادا کیا جائے گا اور آئندہ کسی قوم یا ادارے سے کوئی قرضہ نہیں لیا جائے گا۔ مکمل طور پر اپنے وسائل سے کام چلایا جائے گا۔ غیر ضروری اور غیر پیداواری اخراجات بیک جنبش قلم ختم کر دیئے جائیں گے۔ سادگی اور کفایت شعاری قومی نعرہ ہو گی۔ سادگی اوپر سے نیچے کی طرف سفر کرے گی۔ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں بعد المشرقین کو ختم کر دیا جائے گا۔

۴۔ **صنعتی انقلاب**..... ہمارے ہاں بے پناہ ذہانت و صلاحیت موجود ہے وہ صرف استعمال نہیں ہو رہی۔ انقلاب کے نتیجے میں جب مختلف صلاحیتوں کو مجتمع کیا جائے گا اور انہیں ضرورت کے مطابق سرمایہ اور وسائل مہیا کئے جائیں گے تو کوئی وجہ نہیں کہ چند ہی سالوں میں ہم وہ کچھ خود پیدا نہ کرنے لگیں جو آج درآمد کرتے ہیں۔ ہماری سرزمین میں جو بے شمار دفینے ہماری ضرب کلیمی کے منتظر ہیں ان سے انتفاع عام کی فوری اور بھرپور کوشش کی جائے گی۔ ایجاد و اختراع میں نوجوانوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی جائے گی بلکہ انہیں وسائل اور پشت پناہی بھی مہیا کی جائے گی۔

۵۔ پین اسلام ازم...... جیسا کہ آپ جانتے ہیں حقیقی انقلاب کسی جغرافیائی حدود کا پابند نہیں ہوتا چنانچہ ایک صحیح اسلامی انقلاب انشاءاللہ آگے بڑھ کر پوری امت کو سیراب کرے گا۔ اور پچاس کے قریب مسلم ممالک ایک جسد واحد کی صورت متحد و مربوط ہو جائیں گے۔ ایک کے وسائل دوسرے کے اور دوسرے کی افرادی قوت تیسرے کے کام آئے گی۔ سب کا درد ایک اور سب کی قوت بھی ایک ہو جائے گی۔ اور یوں ایک عظیم الشان اسلامی قوت وجود میں آجائے گی۔ پھر کوئی بعید نہیں کہ پوری دنیا کی قیادت آپ کے ہاتھ میں ہوگی۔ کمزور قومیں مدد و استعانت کے لئے آپ کی طرف دیکھا کریں گی اور آپ کے اشارۂ آبرو سے اقوام عالم کی تقدیروں کے فیصلے ہوں گے پوری دنیا سے ظلم و استحصال کا خاتمہ ہو گا اور انسانیت کا رخ جذبات سفلی سے اخلاق اعلیٰ کی طرف پھر جائے گا۔ پوری دنیا ھُوَ الَّذِیٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ کے کلمۂ حق سے گونج اٹھے گی..... دیگر ادیان باطلہ سرنگوں اور زبردست ہوں گے و ھم صاغرون
لیکن اس سب کے لئے قربانیوں کی ضرورت ہے۔ کچھ سرفروشوں اور کفن بردوشوں کی مانگ ہے۔

اے ابنائے وطن ہے ہمت ہے

قربِ الٰہی کے دو مراتب

کتاب و سُنّت کی روشنی میں

کے موضوع پر

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ایک اہم خطاب

اب کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے

سفید کاغذ، عمدہ کتابت و طباعت، صفحات ۹۶ ، ہدیہ -/۱۰ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدّام القرآن، ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن۔ لاہور

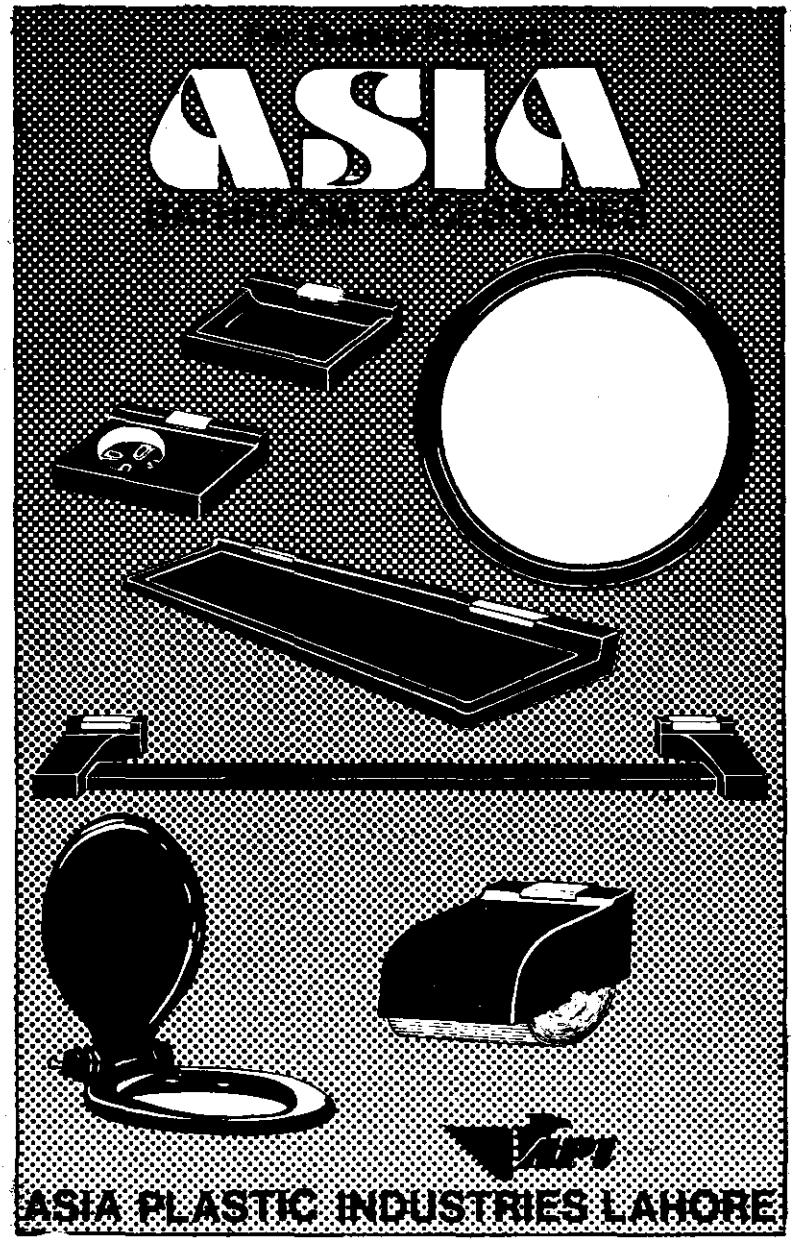
ASIA
ASIA PLASTIC INDUSTRIES LAHORE

شیخ رحیم الدین

مجلس کے آداب

انسانی شخصیت انفعال پذیر ہوتی ہے جو کہ اپنے دوستوں کے اخلاق، عادات و اطوار سے غیر شعوری طور پر اثرات قبول کرتی ہے۔ اس لئے ایسے لوگوں کی دوستی اختیار کرنی چاہیئے جو کہ نیک اور صالح ہوں کہ جنہوں نے اپنی زندگی میں تقویٰ کی روش کو اختیار کیا ہوا ہو کیونکہ ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے شخصیت میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔

- مجلس میں آتے اور جاتے وقت سلام کرنا چاہیئے۔
- مجلس میں بیٹھنے کے لئے دو آدمیوں کو ہٹا کر نہ بیٹھے، جہاں آسانی سے جگہ مل جائے بیٹھ جائے ہٹا کر بیٹھنا متکبرین کا طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی آدمی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ دو آدمیوں کے درمیان (اپنے بیٹھنے کے لئے) تفریق کرے مگر ان کی اجازت سے (جامع الترمذی)
- اسی طرح کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ خود بیٹھنا بھی سخت معیوب ہے۔
- آدابِ مجلس میں یہ بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ دو آدمی تیسرے بھائی سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ تیسرا بھائی اسے اپنے خلاف ہونے کا شبہ کرے۔
- حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم تین ہو تو دو (آدمی) تیسرے (ساتھی) سے الگ ہو کر سرگوشی نہ کریں یہاں تک کہ تم لوگوں سے مل جاؤ اس لئے کہ یہ (تیسرے سے الگ ہو کر دو آدمیوں کی سرگوشی) اسے غمزدہ کرے گی۔ (صحیح مسلم)
- مجلس میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے اگر کوئی کسی ضرورت کی وجہ سے اٹھ کر گیا ہو تو اس کی جگہ پر نہ بیٹھیں۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو گیا ہے کہ وہ واپس نہیں آئے گا تو پھر اس کی جگہ پر بیٹھنے میں کوئی

مضائقہ نہیں ہے ۔

- مجلس میں کسی امتیازی جگہ پر بیٹھنے سے اجتناب کیجئے ۔ اسی طرح مجلس میں ادب سے بیٹھئے۔ پاؤں پھیلا کر یا صاحبِ صدر کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھنا آدابِ مجلس کے خلاف ہے ۔
- مجلس میں جہاں جگہ ملے بیٹھ جانا چاہیئے اور اس طرح بیٹھنا چاہیئے کہ آنے والے اور جانے والے لوگوں کو زحمت نہ ہو ۔ اور اگر لوگ زائد ہو جائیں تو سمٹ کر بیٹھ جانا چاہیئے اور آنے والوں کو خندہ پیشانی سے جگہ دینی چاہیئے ۔
- مجلس میں اگر آپ نے کچھ کہنا ہو تو صدرِ مجلس سے اجازت طلب کریں اگر وہ اجازت دیدیں تو اپنی بات کہیں اور اگر وہ اجازت نہ دیں تو پھر دل میں ملال نہ آنے دیں ۔
- مجلس میں جو باتیں راز کی ہوں اس کو لوگوں سے بیان نہ کریں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "المجالس بالامانۃ" یعنی مجلس کی باتیں امانت ہیں ۔
- مجلس میں جس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہو جب تک وہ طے نہ ہو جائے اس میں دوسرا موضوع نہ چھیڑیئے اور دوسروں کی بات کاٹ کر اپنی بات شروع نہ کیجئے ۔ اور اگر کبھی ایسی کوئی ضرورت پیش ہی آگئی ہے تو بولنے سے پہلے اجازت لے لیجئے ۔
- مجلس میں صرف دنیا کی باتیں کرنا اور صرف دنیا کے کام کرنا اور ذکر اللہ سے محروم رہنا شدید محرومی ہے ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی جگہ پر بیٹھے اور اس میں اللہ کا ذکر نہ کرے ۔ اس پر اللہ کی طرف سے حسرت ہے (یعنی وہ قیامت کے دن افسوس کرے گا) ۔
- کوشش کیجئے کہ آپ کی کوئی مجلس خدا اور آخرت کے ذکر سے خالی نہ رہے ۔ اور جب آپ محسوس کریں کہ حاضرین دینی گفتگو میں دلچسپی نہیں لے رہے تو گفتگو کا رخ کسی دنیوی مسئلہ کی طرف پھیر دیں اور پھر جب مناسب موقع پائیں تو گفتگو کا رخ حکمت کے ساتھ دینی موضوع کی طرف پھیرنے کی کوشش کریں ۔
- حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخر میں جب مجلس سے اٹھنے کا ارادہ کرتے تو یہ دعا کرتے ۔

سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا إله الا انت

رفتارِ کار

امیرِ تنظیم اسلامی کا تین روزہ دورۂ فیصل آباد

مرتب : محمد یعقوب

گذشتہ اجلاسِ شوریٰ میں فیصلہ ہوا تھا کہ محترم ڈاکٹر صاحب پاکستان میں تنظیمی اعتبار سے قائم مختلف حلقوں کو اپنے قیمتی وقت میں سے ہر ماہ تین دن دیا کریں گے..... اس سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر فیصل آباد سے جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کا مراسلہ موصول ہوا کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ وہاں ۲۹ر تا ۳۱ر جولائی کے پروگرام میں تشریف لا رہے ہیں لہٰذا آپ بھی آئیے اور رفقاء کو بھی ساتھ لائیے۔

ہم پانچ رفقاء گوجرانوالہ سے علی الصبح فیصل آباد پہنچے تو ہمارا خیال یہ تھا کہ فیصل آباد والے اپنی محدود افرادی قوت (۲۹ رفقاء صرف) اور محدود مالی وسائل کے پیشِ نظر کوئی بھرپور پروگرام ترتیب نہیں دے سکیں گے، لیکن کوچ جونہی فیصل آباد کے مضافات میں پہنچی ہم نے ایک خوشگوار حیرت سے دیکھا کہ ہر بڑے چوک میں جہازی سائز کے کپڑے کے بینرز آویزاں ہیں جن پر محترم المقام جناب ڈاکٹر صاحب کی آمد کی نوید اہل شہر کو سنائی گئی ہے۔ سفید براق کپڑے کے یہ بینرز صبح کی نرم روٹھنڈی ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے گویا امیر محترم کی آمد پر خنداں و رقصاں ہوں۔ ہم سے دور ایک پر رونق چوک میں رکشہ میں بیٹھے کوئی صاحب لاؤڈ سپیکر کے ذریعہ امیر محترم کی فیصل آباد میں آمد اور خطاب عام کا اعلان بڑے دلپذیر لب ولہجہ میں کر رہے تھے۔ کوچ سے اتر کر ہم احسان پرنٹنگ پریس (جہاں استقبالیہ شعبہ تھا) کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ فیصل آباد تنظیم کی سوزوکی پک اپ ہمیں خوش آمدید کہنے کو پہنچ گئی..... معلوم ہوا ان تین دن کے لئے ہمارا قیام جناح کالونی میں واقع پی ایم اے کی عمارت میں ہو گا۔ وہاں ایک زیر تعمیر بڑے آڈیٹوریم میں ہماری عارضی رہائش کا انتظام تھا۔ اتنی کوئیک سروس اور اس قدر درست انتظام!

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

پی ایم اے کی زیر تعمیر عمارت میں مختلف شہروں سے آئے ہوئے رفقاء کافی تعداد میں جمع تھے۔ حلقہ وسطی پنجاب جس کا ہیڈ کوارٹر فیصل آباد ہے' گوجرانوالہ ڈویژن کے تمام اضلاع' فیصل آباد ڈویژن کے تمام اضلاع اور سرگودہا ڈویژن کے تمام اضلاع (ماسوائے جھنگ) پر مشتمل ہے۔ لہٰذا مختلف اضلاع سے ستاون ۵۷ رفقاء وہاں جمع تھے۔ اپنے کام کاج چھوڑ کر اپنی گوناگوں مصروفیتوں سے نکل کر' اپنے عزیزوں اور بچوں سے جدا ہو کر' اپنے وقت اور اپنے پیسے کا ایثار کر کے' اپنی محبتوں اور اپنے مشاغل کو تج کر مختلف پیشوں' مختلف تعلیمی معیار' مختلف سماجی اور معاشی پس منظر کے ساتھ وہاں جمع تھے۔ کس لئے؟ اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے' اللہ کی سرزمین پر اللہ کی حکمرانی کا ڈنکہ بجانے کا سودا لئے' اُس عظیم اسلامی انقلاب کا تصور دلوں میں بسائے جس سے تمیز آقا و بندہ مٹ جائے گی' جس سے ۔

پھر دلوں کا یاد آجائے گا پیغام سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی

معلوم ہوا قبلہ ڈاکٹر صاحب جمعہ کی نماز جناب سیاح الدین کاکاخیل کی قائم کردہ مسجد اور دارالعلوم "اشاعت العلوم" لکڑ منڈی میں پڑھائیں گے۔ اس ادارہ جلیلہ کے ناظم جناب عبدالرشید ارشد صاحب ہیں اور مسجد کے خطیب جناب مسلم قاسمی صاحب ہیں جنہوں نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کا تعارف کراتے ہوئے ہماری معلومات میں یہ بیش قدر اضافہ کیا کہ موصوف "خان" بھی ہیں..... دونوں جلیل القدر اصحاب علم نے جس خوشدلی اور تعاون علی البر کا مظاہرہ فرمایا' تنظیم اسلامی فیصل آباد ان کی تہہ دل سے ممنون ہے۔

یہاں بھی فیصل آباد کی تنظیم کے رفقاء' اُن کے امیر جناب رحمت اللہ بٹر صاحب اور حلقہ کے امیر جناب ڈاکٹر عبدالسمیع صاحب کی محنتوں کا ثمر ہمارے سامنے تھا..... اشاعت العلوم کی وسیع مسجد کانوں کان بھری ہوئی تھی اور لوگ غضب کی گرمی اور حبس میں مسجد کے صدر دروازے تک امیر محترم کی پکار پر گوش بر آواز تھے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے مخصوص طرز تخاطب اور مردانہ لب ولہجہ کے ساتھ سورۃ الصف اور سورۃ الجمعہ کی روشنی میں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصدِ بعثت اور اس سلسلہ میں امت کی ذمہ داریوں پر گفتگو فرما رہے تھے۔ ایک سحر تھا جو پورے مجمع پر طاری تھا' ایک اعجاز نطق تھا جو دلوں کو برما رہا تھا' رقت تھی کہ بار بار امنڈی چلی آتی تھی..... اللہ کرے زور خطاب اور زیادہ۔

جمعہ ۲۹ر جولائی ہی کی شام کو ضلع کونسل کے وسیع سبزہ زار میں محترم ڈاکٹر صاحب کا

خطاب عام تھا۔ فیصل آباد کی تنظیم کے رفقاء اپنے امیر کی سربراہی میں فیصل آباد جیسے وسیع شہر کے گلی گوچوں میں منادی لگا رہے تھے۔ گرمی اور حبس کی پرواہ کئے بغیر، تھکن اور بے آرامی کے باوصف، وسائل کی کمی کے باوجود..... اور اس کا نتیجہ مغرب کی نماز کے بعد ضلع کونسل کے سبزہ زار پر نکلا، جہاں ہزاروں لوگ کاروں، سکوٹروں، سائیکلوں پر اور پیدل ہجوم کئے ہوئے تھے۔ وسیع لان پر بچھی دریاں بھر گئیں ان سے پیچھے قطار اندر قطار پڑی کرسیاں کم پڑ گئیں اور سینکڑوں لوگ یا تو کھڑے رہے یا لان کی مخملیں گھاس پر بیٹھ گئے۔ نماز مغرب کے کچھ دیر بعد خطاب شروع ہوا..... موضوع تھا "فلسفہ شہادت" عوام کا مجمع اور یہ خالص علمی موضوع! دل میں خوف پیدا ہوا کہ "عوام" کو کیا چیز بٹھائے رکھے گی؟۔ نہ فرقہ واریت کا چٹخارہ، نہ سیاست کی شیرینی، نہ دشنام و تکفیر کا بارہ مصالحہ، نہ سبز باغ دکھانے کا گڑبڑ گھٹالہ..... لیکن ڈاکٹر صاحب نے شہادت کے مروجہ مفہوم سے لے کر شہادت علی الناس کے زروۂ سنام تک کے مختلف مراتب و مراحل سے عوام کو یوں روشناس کرایا کہ میں نے سینکڑوں سروں کو ہلتے اور بیسیوں کو وجد کرتے پایا..... بے پناہ گرمی تھی اور حبس ایسا کہ جس کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے "وہ حبس ہے کہ لو کی دعا مانگتے ہیں لوگ!" مشرق اور جنوب میں واقع سڑکوں پر ٹریفک کا شور اس پر مستزاد..... لیکن لوگ یوں جم کر بیٹھے اور بیٹھ کر جمے کہ آخری لفظ ادا ہونے تک ایک تنکا تک نہیں ہلا۔ ڈاکٹر صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم (فداہ ابی وامی) کی سنت مطہرہ اور خلفائے راشدین کے عمل کا نقشہ ایسے پراثر اور دلسوز الفاظ میں کھینچا کہ عوام تو عوام خواص تک کے دل پگھل پگھل گئے۔ اعلان ہوا اس کے دوسرے اور عملی حصے کا بیان کل یعنی ۳۰ر جولائی کی شام کو یہیں اسی وقت ہوگا ع

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا

رات ساڑھے نو بجے یہ محفل دلپذیر اور وعظ دلگداز اختتام کو پہنچا۔ نماز عشاء وہیں ادا کی گئی۔

ہمارا خیال تھا۔ ۳۰ جولائی کا پورا دن رفقاء اپنی تھکن اتارنے اور اپنی توانائیوں کو مجتمع کرنے میں گزاریں گے لیکن کہاں؟ "اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا" اب معلوم ہوا دس بجے صبح سے ایک بجے دوپہر تک ریکس ہوٹل کا ایئر کنڈیشن ہال بک ہے جہاں امیر محترم فیصل آباد کے اہل علم و دانش سے "اہل علم و دانش کی ذمہ داریوں" کے موضوع پر خطاب کریں گے۔ ۹ بجے صبح سوزوکی پک اپ اور سفید ویگن پھر حرکت میں آئیں اور ہم لدپھند کر وہاں پہنچے۔ ساڑھے دس بجے تک ہال اپنی تنگ دامانی پر شکوہ سنج تھا۔

خطاب شروع ہوا اب کے رنگ ہی اور تھا۔ اگرچہ مرکزی خیال وہی تھا جس نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کی راتوں کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے یعنی اعلائے کلمۃ اللہ' حکومت الٰہیہ کا قیام اور اسلامی انقلاب لیکن محفل تھی اہل علم و دانش کی' چنانچہ ضروری ہوا کہ بات کسی اور رخ سے سامنے آئے..... "اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں" امیر محترم نے "علم کی وحدت" کا فلسفہ پیش فرماتے ہوئے کہا کہ علم انسان کی مشترکہ میراث ہے اور اسے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ علم دین کو اگرچہ دیگر علوم پر فوقیت و برتری حاصل ہے لیکن دیگر علوم حواسی و قلبی سے صرفِ نظر نقصان دہ ہے' اس کی تقسیم کی وجہ سے علمائے دین مدرسوں اور خانقاہوں میں محدود ہو کر رہ گئے ہیں اور ایوانہائے حکومت و اقتدار پر سیکولر ذہن رکھنے والا طبقہ قابض ہو گیا ہے نیز آپ نے علماء دین کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ "دین کے محدود تصور" سے نکلیں اور "دین" کے اصل تقاضوں یعنی غلبہ دین و اقامت دین کی منزل کی طرف ہماری اور عوام الناس کی راہنمائی فرمائیں۔ یہ خطاب کوئی سوا بارہ بجے تک جاری رہا۔ بعدہ' سوالات کی دعوت دی گئی جن سے ڈاکٹر صاحب اپنی خداداد ذہانت سے باحسن وجوہ عہدہ بر آ ہوئے..... چائے تو ہونا ہی تھی سو ہوئی اور ایک بجے یہ یادگار محفل بادل نخواستہ برخواست ہوئی کہ ظہر کا وقت قریب تھا۔

۳۰ر جولائی کو ظہر کی نماز کے بعد دوسرے مقامات سے آئے ہوئے رفقاء تو رات بھر کی تھکن اتارتے رہے لیکن آفرین ہے فیصل آباد کے رفقاء پر کہ وہ پھر اس وسیع شہر کے گلی کوچوں میں پھیل گئے اور بعد از نماز مغرب کے خطاب عام کی منادی کرنے لگے..... خدشہ تھا کہ آج کی حاضری قدرے کم ہوگی اس لئے کہ گذشتہ روز جمعۃ المبارک کی تعطیل عام کی وجہ سے لوگ زیادہ تعداد میں آئے تھے' اور آج چونکہ یوم کار (WORKING DAY) ہے اس لئے لوگ کم ہوں گے..... لیکن مغرب کے بعد جونہی ضلع کونسل کے سبزہ زار پر آوازۂ حق بلند ہوا' لوگوں کی ٹولیاں ضلع کونسل کے باب النور سے داخل ہونا شروع ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے مجمع کل سے بھی قدرے بڑھ گیا۔ اس میں جہاں فیصل آباد کی تنظیم کی محنت شاقہ کا ہاتھ تھا وہاں لوگوں کی اپنی "پیاس" اور "تلاش حق" کو بھی دخل تھا۔

امیر محترم نے گذشتہ روز کے خطاب کی تلخیص سے تقریر کا آغاز فرمایا اور پھر بحالیٔ جمہوریت اور عوام کے حقوق کی بازیابی کے موضوع سے ہوتے ہوئے اپنے اصل موضوع یعنی اسلامی انقلاب کے مراحل و لوازم کو نہایت جوش و خروش اور انشراح صدر سے بیان فرمایا۔

اس موضوع پر راقم الحروف نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کو بیسیوں بار سنا ہے لیکن آج رنگِ دگر تھا..... امیرِ محترم نے گلے کی خرابی (جو مسلسل استعمال پر بطور احتجاج بیٹھا جا رہا تھا) کے باوجود رات ساڑھے دس بجے تک قلب کو گرمایا اور روح کو تڑپایا۔ عوام نے پوری دلجمعی سے سنا۔ دو ڈھائی گھنٹہ اس حبس میں بیٹھنا خصوصاً جبکہ عوام کا مخصوص بارہ مصالحہ بھی نہ ہو خاصا کٹھن کام تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے لوگ اب روایتی سیاست بازوں کی بجائے کسی مردِ حق آگاہ کی تلاش میں ہیں۔

رات ساڑھے دس بجے حسب معمول لان میں عشاء کی با جماعت نماز ادا کی گئی اور پھر دیگر تمام حضرات تو شب بسری کے لئے روانہ ہوئے جبکہ رفقاء تنظیم نے جلسہ گاہ میں بچھی ہوئی دریاں اور بکھری ہوئی کرسیاں سمیٹنا شروع کیں۔ یہاں میں گجرات کے رفقاء کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا وہ جس محنت، لگن اور شوق سے کام کرتے ہیں لائق صد تحسین اور قابل تقلید ہے۔

۳۱ر جولائی اتوار کو صبح ناشتے کے بعد محترم ڈاکٹر صاحب پی ایم اے کی عمارت میں رفقاء سے ذاتی رابطہ کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے تھکن اور بے آرامی کے باوجود تمام رفقاء کا ذاتی تعارف حاصل کیا اور مفید پند و نصائح سے نوازا..... آپ نے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا "میں فیصل آباد کی تنظیم کو اس عمدگی اور محنت سے اجتماع منعقد کرنے پر خراج تحسین پیش کرتا ہوں اور ان کے جذبے اور لگن کے پیش نظر اس بات پر بھی آمادہ ہوں کہ ہر ماہ فیصل آباد میں درس قرآن دینے کے لئے حاضر ہو جاؤں"۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ہر شخص اچھی طرح جان لے کہ ہماری جدوجہد کا محور و مرکز قرآن ہے لہٰذا تمسک بالقرآن اختیار کیجئے اور اسے دل کے اندر اتاریئے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا کہ انفرادی نیکی کے ساتھ اجتماعی نیکی کی طرف بڑھیے۔ تنظیم ایک مشکل ترین کام ہے اس میں انسان کو "انا" کی قربانی دینا پڑتی ہے لیکن تنظیم کے بغیر کسی موثر اور نتیجہ خیز تحریک کا آغاز نہیں کیا جا سکتا۔

دوران گفتگو نئے مرتب شدہ تنظیمی و تربیتی نصاب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے آپ نے فرمایا تمام رفقاء بالعموم اور سینئر رفقاء و بالخصوص اس بات کا برا نہ مانیں کہ انہیں از سر نو بعض بنیادی کتابچوں اور کیسٹوں میں سے گزرنا پڑے گا۔ اسے قند مکرر کے طور پر پڑھیں اور اسے کرنے کا ایک اہم کام جانیں۔

آپ نے رفقاء کو تلقین کی کہ کسی ہنگامی سیاست بازی یا ہنگامی عوامی تحریک کی چکاچوند سے مرعوب نہ ہوں اور پورے صبر و سکون کے ساتھ اپنا اصل کام یعنی ذاتی تربیت، تنظیم اور

کردار سازی پر توجہ مرکوز رکھیں اپنے ارادوں کو بلند اور اپنی ہمتوں کو مجتمع رکھیں۔
گھنٹہ بھر کی اس نشست کے آخر میں آپ نے بعض رفقاء کے سوالات کے جوابات دیئے اور دعا پر یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

محترم ڈاکٹر صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان جناب میاں محمد نعیم صاحب نے امراء نقباء اور ذمہ دار حضرات کو پکڑ بلایا اور امیر محترم کی رفقاء سے ملاقات کی روشنی میں آئندہ مجوزہ اجتماع رفیقان حلقہ وسطی کی تاریخ اور مقام کے بارے میں مشورہ کیا۔ اب دوپہر کا کھانا تیار تھا۔ کھانے کے بعد گوجرانوالہ، سیالکوٹ اور گجرات سے آئے ہوئے بیشتر رفقاء خوشگوار یادیں لئے روانہ ہوئے۔ لیکن کچھ رفقاء سوال و جواب کی آخری نشست کے لئے رک گئے جن کی تواضع نقیب اسرہ گوجرانوالہ جناب محمد امین شاد صاحب نے آئس کریم سے کی۔ جزاک اللہ

۳۱ر جولائی کی تپتی ہوئی سہ پہر کو ۴ بجے جب ہم ڈاکٹر صاحب کی معیت میں ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں داخل ہوئے تو معدودے چند لوگ ہی ہال میں موجود تھے۔ مایوسی کی ایک ٹھنڈی لہر میرے دل کو چھوتی ہوئی گزر گئی بہرحال ڈاکٹر صاحب نے کرسی سنبھالی اور چند ایک سوالوں کے جوابات دینا شروع کئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ڈسٹرکٹ کونسل کا ہال بھر گیا۔ سوالات کی پرچیاں آنی شروع ہوئیں تو انبار لگ گئے۔

جوابات دینے کے لئے وقت کا تعین پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ یعنی چار تا ساڑھے پانچ بجے شام۔ اس ڈیڑھ گھنٹہ میں اتنے سارے سوالوں کا جواب ممکن نہ تھا۔ لہٰذا بہت سے اصحاب کو اپنے سوالات کے جوابات سے محروم رہنا پڑا۔ انہیں تنظیم اسلامی فیصل آباد کے دفتر سے رجوع کرنے کو کہا گیا۔ سوالات میں سے بعض تو محض سوالات تھے جبکہ بعض خاصے تیکھے اور پہلودار تھے۔ ان کے جواب بھی امیر محترم نے بڑے تحمل اور بردباری سے دیئے۔ پانچ بجکر ۲۵ منٹ پر ڈاکٹر صاحب اٹھ کھڑے ہوئے کہ ساڑھے پانچ بجے نماز عصر ادا کرنا تھی۔ ہجوم مشتاقاں آپ کے جلو میں تھا۔ ڈسٹرکٹ کونسل کی عمارت کے اندر واقع مسجد میں نماز عصر مقامی امام کی اقتدا میں ادا کی گئی اور وہیں مسجد میں نماز کے بعد چار باہمت افراد نے امیر محترم کے ہاتھ پر بیعت کر کے تنظیم اسلامی کا دست و بازو بننا قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں استقامت عطا فرمائے اور جس راہِ پر خار پر انہوں نے چلنا اپنی آزاد مرضی سے قبول کیا ہے وہ راہیں اُن کے لئے آسان فرمادے۔ آمین ثم آمین۔

بقیہ: حرفِ اول

محترم ڈاکٹر اسرار احمد اپنی جماعت 'تنظیم اسلامی' اپنی انجمن 'انجمن خدام القرآن اور اپنے سامعین کے مستقل حلقے یعنی مسجد دارالسلام باغ جناح میں یہ آوازہ لگا چکے ہیں کہ قرآن کالج میں نئے سال کے آغاز کے لئے اپنے بیٹوں اور اپنے حلقہ احباب میں موجود بچوں کو تیار کریں۔ قارئین "میثاق" کو ہم دعوت دیتے ہیں کہ ع

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

وہ بھی اپنے گھر اور آس پاس کا جائزہ لیں اور تندرست و توانا' ذہین اور ہونہار طلبہ کو قرآن کالج سے بی۔ اے پاس کرنے کی ترغیب دیں۔ انجمن کے ذرائع و وسائل اگرچہ محدود ہیں تاہم مناسب خرچ پر ہوسٹل کا بھی معقول انتظام کیا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور سے باہر کے طلبہ کے لئے بھی کوئی عذر موجود نہیں۔ دین کی سربلندی و سرفرازی اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی خواہش جن دلوں میں موجود ہے کم از کم انہیں تو ضرور یہ بات سمجھ لینی چاہئے کہ یہ کام محض دعاؤں سے نہیں ہو گا' کچھ کئے ہی بات بنے گی۔ ہم خود اگر اپنی توانائیاں دنیا کے حصول میں لگانے پر مجبور ہو گئے ہیں تو اپنی اولاد کی زکوٰۃ ہی نکالیں۔

اور آخری گزارش اس سلسلے میں یہ ہے' جس کے بغیر بات مکمل نہ ہو گی' کہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنے اعوان و انصار' سامعین اور قارئین کو یہ دعوت دینے سے پہلے خود اپنے بچوں کو اس کام پر لگایا' اپنے اعزہ اور اقرباء کو اس پر آمادہ کیا اور اللہ کے دین کے لئے جھولی سب سے پہلے اپنے خاندان کے سامنے ہی پھیلائی تھی۔ رفاقت سکیم میں ان کے دو بیٹے (ایک ایم بی بی ایس اور دوسرا ایم اے) اور دو سالہ نصاب میں ایک چھوٹا بھائی اور تین داماد شریک تھے جن میں سے ایک داماد ہی نہیں' بھتیجا بھی تھا۔

قرآن کالج میں بی اے کے داخلوں کا آغاز ماہ ستمبر میں لاہور بورڈ کے ایف اے/ایف ایس سی کے نتائج کے اعلان کے بعد ہو گا۔ داخلے اور انٹرویو کی حتمی تاریخوں کا اعلان ان شاء اللہ آئندہ اشاعت میں کیا جائے گا۔

بچوں کے لئے ایک خوبصورت، منفرد اور معیاری رسالہ

ماہنامہ **کوثر** لاہور

— قرآن حکیم کی تعلیمات کو نہایت آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کرتا ہے۔
— جنوں، بھوتوں اور پریوں کی جھوٹی کہانیوں سے پاک حقیقی سائنسی اور اسلامی جذبے کو بیدار کرنے والے واقعات۔
— بچوں کی ذہنی و فکری تربیت کے لئے نہایت مفید رسالہ۔
— سفید کاغذ اور آفسٹ کی نہایت شاندار طباعت کے باوجود ہدیہ فی شمارہ صرف -/۳ روپے۔ سالانہ زرِ تعاون -/۳۰ روپے
— درج ذیل پتہ پر ایک خط لکھ کر نمونے کا پرچہ مفت طلب کریں۔ پسند آئے تو اپنے بچوں کو مستقل خریدار بنائیں۔

ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ۔ ۷۲۔ عمر دین روڈ وسن پورہ لاہور ۲۹
پاکستان

مولانا محمد طاسین کی معرکۃ الآراء تصنیف

مروجہ نظامِ زمینداری اور اسلام

اشاعت کے مراحل میں ہے اور عنقریب چھپ کر آجائے گی (اِنْ شَاءَ اللّٰہ)

عمدہ سفید کاغذ، دیدہ زیب طباعت، خوبصورت اور مضبوط جلد

قیمت ۳۵ روپے

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور، ۳۶۔ کے۔ ماڈل ٹاؤن

ہر محفل کا میزبانِ خصوصی

رُوح افزا

تقریب کی نوعیت پر منحصر نہیں۔ کوئی موقع ہو، کیسی ہی محفل ہو،
ضیافت اور مہمان نوازی کے لیے رُوح افزا پیش پیش۔

فرحت، تازگی اور توانائی کے لیے بے مثال
رنگ، خوشبو، ذائقے، تاثیر اور معیار میں لازوال۔

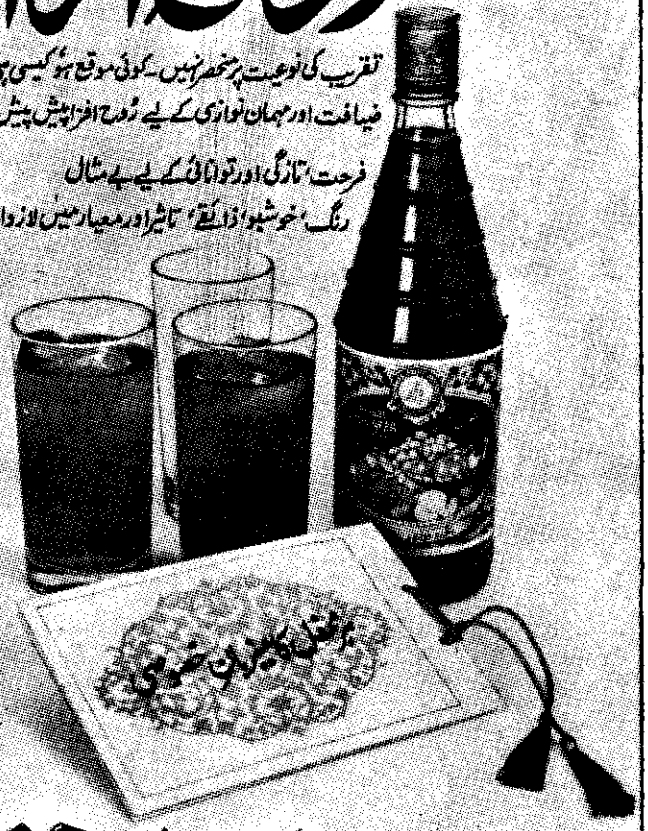

رُوح پاکستان۔ رُوح افزا
راحت جان۔ رُوح افزا

ہمدرد
ہم خدمت خلق کرتے ہیں

خدمتِ خلق رُوحِ اخلاق ہے

ADARTS

HMD-6/87

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا

اور سب مل کر اللہ کی رسّی مضبوط پکڑو اور پھوٹ نہ ڈالو

Seiko
BRAKE + CLUTCH LINING

میسی فرگوسن ٹریکٹر کے ہر ماڈل پرزہ جات کے ہول سیل ڈیلر

S SEIKO سٹاکسٹ: طارق آٹوز ۱۳۔ نظام آٹو مارکیٹ بادامی باغ لاہور۔ فون: ۲۰۰۹۶۰

ہر قسم کے بال بیرنگز کے مرکز

سندھ بیرنگ ایجنسی ۶۵۰۔ منظور اسکوائر پلازہ کوارٹرز۔ کراچی۔ فون: ۷۲۳۳۵۸ ۷۲۱۱۷۲

خالد ٹریڈرز۔ بالمقابل کے۔ ایم۔ سی ورکشاپ۔ نشتر روڈ۔ کراچی

فون: ۷۳۵۸۸۳ — ۷۳۲۹۵۱۲ — ۷۳۰۵۹۵

بیرونِ پاکستان خریدار حضرات متوجہ ہوں

آپ کی سہولت کے لئے مندرجہ ذیل مقامات پر ہمارے نمائندگان موجود ہیں۔

زرِتعاون اور تجاویز و شکایات ان کے پاس بھجوائے جا سکتے ہیں ۔۔۔!!

برائے جدّہ (سعودی عرب)

MR. MUHAMMAD ASGHAR HABIB
CCT20 SAUDIA P.O. BOX 167
JEDDAH 21231 K S A
TEL : OFF : 6513140 RES: 6721490

برائے سعودی عرب

MR. ABDUR RAUF
P.O. BOX 3691
RIYADH 11481 KSA
TEL : OFF : 4771614 RES : 4771539

15/16/36

برائے مشرقِ وسطیٰ و امارات

MR. MOHAMMAD HANEEF DAR
JAMIAT KHUDAMUL QURAN
P.O. BOX 388 ABU DHABI UAE

برائے یورپ

MR SYED HASHIM
2 FALCON CRESCENT, PONDERS END
ENFIELD, MIDDLE ESEX EN 3 4LT UK.
TEL : 01 - 804 - 1295

برائے امریکہ

DR. KHURSHID A. MALIK
SOCIETY OF THE SERVANTS OF AL-QURAN NORTH-AMERICA
810, 73rd STREET, DOWNERS GROVE ILLINOIS 60516 USA
TEL : 312, 964-7806, 312-969-6755

برائے کنڈا

MR. ANWAR-UL-HAQ QURESHI
SOCIETY OF THE SEVANTS OF AL-QURAN NORTH AMERICA
323, RUSHOLMS ROAD 1809 TORONTO OFFICE
TORONTO ONT M6H 2Z2 CANADA
TEL: 416-531-2902, 416-596-0447

برائے بھارت

MR. HYDER MOHI UD DIN GHAURI
ANJUMAN KHUDAM-UL-QURAN
4-1-444 2nd FLOOR BANK STREET
HYDERABAD 500001 AP INDIA
TEL: 42127

Jawad

We are manufacturing and exporting ready made garments (of all kinds including shirts, trousers, blouses, jackets, uniforms, hospital clothing; kitchen aprons), bedlinen, cotton bags, textile piece goods etc.

For further details write to :

M/s. Associated Industries (Garments) Pakistan (Private) Ltd.,
IV/C/3-A (Commercial Area),
Nazimabad,
Karachi - 18
Tele : 610220/616018/625594

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

Regd. L. No. 7360
VOL. 37 No. 8
AUGUST 1988

هُوَالَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ ط وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ○ (سورۃ الصف)

وہی (اللہ) ہے جس نے کہ بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (یعنی قرآنِ حکیم) اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ وہ اُس کو غالب کر دے پورے کے پورے دین پر، خواہ ناپسند کریں مشرک۔

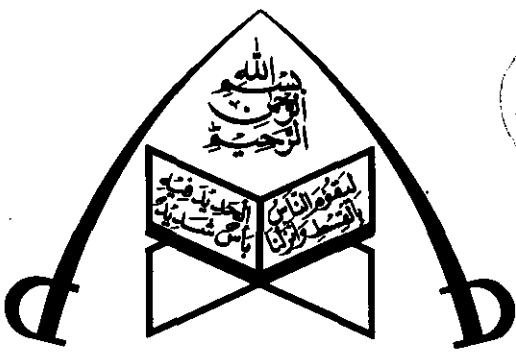

تنظیمِ اسلامی

نہ کوئی سیاسی جماعت ہے نہ مذہبی فرقہ
بلکہ ایک
اسلامی انقلابی جماعت ہے

جو سب سے پہلے پاکستان میں اور بالآخر ساری دنیا میں
اسلام کے عادلانہ نظام کو قائم اور غالب کرنا چاہتی ہے

مرکزی دفتر: ۶۷۔اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو۔ لاہور